

# جَنّات کے دربار میں

استوائی محبہ

جریم اور نسلِ غرسانی کی چار سچی کہانیاں

احمد یار خان

**PDFBOOKSFREE.PK**



## پیش لفظ

محترم احمد یار خان کی تفتیشی کہانیوں کا سہ ماہی مجموعہ پیش کیا جا رہا ہے۔ اس میں چار طویل کہانیاں شامل کی گئی ہیں۔

احمد یار خان کا نام تعارف کا محتاج نہیں۔ جرم و سزا تفتیش اور سہ ماہی میں محترم احمد یار خان کا نام سند کی حیثیت رکھتا ہے۔ ان کہانیوں میں مصنف کی دوسری کہانیوں کی طرح جرم کا صرف ارتکاب نہیں دکھایا گیا بلکہ ہر کہانی میں جرم کا پس منظر بیان کیا گیا ہے۔ اس طرح ہر کہانی صرف جرم و سزا کی نہیں بلکہ چار دیواری کی دنیا کی بھی کہانی ہے۔

قتل جیسے بڑا ایک جرم کرنے والوں میں کوئی ایک بھی جرائم پیشہ نہیں۔ سب بے ضرر سے افراد ہیں۔ ان کے ذہنوں سے معمولی سے جرم کا بھی کبھی گزر نہیں ہوا تھا مگر ان پر ایک لمحے کا پاگل پن طاری ہوا اور قتل کی ایسی واردات ہو گئی کہ قاتل کا۔ سزا کا ناقض یا ناممکن ہو گیا۔ اس لمحے کے پیچھے بڑی لمبی لمبی داستانیں ہیں جنہوں نے بے ضرر سے افراد کو اس لمحے تک پہنچا دیا جہاں انسان اپنی جان بے لیتا ہے یا کسی کی۔ جب یہ لمحہ گزر جاتا ہے تو ان حقیقی ڈراموں سے روہ اٹھتا ہے جو آپ کو پوری تفصیل سے سناتے جا رہے ہیں۔

مصنف کا انداز بیان ایسا ہے کہ آپ پڑھتے وقت محسوس کریں گے جیسے آپ فلم دیکھ رہے ہیں یا جیسے ہر واردات اور تفتیش آپ کے سامنے ہو رہی ہے۔ ہر کہانی پڑھ کر آپ کو اپنے ہوش و حواس میں آنے میں خاصی دیر لگے گی۔

عنایت اللہ

مدیر: ماہنامہ حکایت لاہور

# فہرست

## ایک خط ایک جذبہ

ہندوؤں کے اُس علاقے میں جراتم بہت ہی کم ہوتے تھے۔  
 آج کل کی طرح ہر روز چور لویوں کی بھرمار نہیں تھی۔ کبھی کبھار لقب لگتی یا  
 ڈاکہ پڑا کرتا تھا۔ دیہاتی علاقے میں رہنری اور قتل کی وارداتیں ہوتی  
 تھیں۔ میں ایک قصبے کے تھانے کا اسپتار ج تھا۔ یہ ہندوؤں کا قصبہ  
 تھا۔ چند ایک گھرانے رکھوں کے اور ان سے بھی کم مسلمانوں کے تھے۔  
 مسلمانوں کی یہاں کوئی حیثیت نہیں تھی۔ جراتم کے لحاظ سے یہ قصبہ  
 پاک صاف تھا۔ اس قصبے میں جب قتل کی ایک واردات ہو گئی تو لویوں  
 پتہ چلتا تھا جیسے خوف و ہراس سے سارا قصبہ مر گیا ہو۔ قتل ہونے والا  
 معمولی آدمی نہیں تھا۔ وہ دولت مند ہندو تاجر تھا۔ سیاست میں بھی  
 اُس کا عمل دخل تھا اور سرکاری حلقوں میں بھی وہ جانا پہچانا جاتا تھا۔ قصبے  
 کے ہندوؤں کا وہ سرگرم لیڈر تھا۔

وہ کوئی بوڑھا آدمی نہیں تھا۔ اُس کی عمر تیس سال سے ایک آدھ

ایک خط ایک جذبہ

محبت کے پھندے سے لوہے کے پھندے تک

لُقمان جیکب کا نسخہ

چنات کے دربار میں

۵

۵۵

۱۱۵

۱۸۲

لاش کے ارد گرد تماشا تیلوں کا جھوم تھا۔ کئی ایک نے لائینیں اٹھا رکھی تھیں۔ مقتول کے لواحقین بھی آگئے تھے۔ لاش کی آنکھیں اس طرح کھلی تھیں جیسے ڈھیلے باہر آجائیں گے۔ زبان باہر آکر دانتوں کے درمیان آتی ہوئی تھی۔ اسی سے میں نے راستے قائم کر لی کہ گلا گھونٹ کر مارا گیا ہے۔ میں نے ایک لائین پکڑ لی۔ لاش کی گردن دیکھی۔ گردن کے گرد وجہ ہوتے خون کا نشان بڑا ہی صاف تھا۔ اسے گلے میں پھندا ڈال کر مارا گیا تھا۔ دیکھنا یہ تھا کہ اسے یہیں مارا گیا ہے یا کہیں اور پھانسی دے کر یہاں پھینکا گیا ہے۔

جھوم میں سے مجھے ایک آواز سنائی دی۔ ”چھی چھی چھی۔ لاش کو مسلمان ہاتھ لگا رہا ہے۔“

میں اپنے آپ کو تالو میں رکھنے کا عادی تھا لیکن اس آواز نے مجھے باؤلا کر دیا۔ میں پاؤں پر بیٹھا لاش کو دیکھ رہا تھا۔ میں اٹھا اور غصے سے کہا۔ ”ہم اس لاش کو ابھی چیریں پھاڑیں گے۔ اسے پھینکیں اٹھا کر مرہ خانے سے باہر پھینکیں گے۔ تمہیں اس کی پاکیزگی کا اتنا خیال ہے تو مجھے لکھ دو کہ یہ قتل نہیں ہوا میں چلا جاتا ہوں۔“ میں نے گرج کر کہا۔ ”بس نے کہا تھا لاش کو مسلمان ہاتھ لگا رہا ہے وہ آگے آؤ۔“

جھوم پیچھے ہٹنے لگا۔ ہندو سامنے آنے کا قائل نہیں ہو کر وہ ہندو جو تھانے آتے تھے میرا غصہ ٹھنڈا کرنے لگے۔ میں نے انہیں لاش تھانے اٹھا لے چلنے کو کہا۔

سال اوپر ہو گی۔ وہ روائتی ہندوؤں کی طرح دھوتی نہیں باندھتا تھا اس کا پیٹ بڑھا ہوا نہیں تھا اور ہندو بنیوں کی طرح اس کا جسم موٹا بھتا نہیں تھا۔ وہ خوب رجوان تھا۔ قد بُت اچھا تھا۔ مسلمانوں جیسا لباس پہنتا تھا۔ میں نے اسے اکثر دیکھا تھا۔ اگر میں اسے نہ جانتا تو اسے مسلمان سمجھتا۔ وہ ذہنی اور نظریاتی لحاظ سے کٹر ہندو تھا اور مسلمانوں کے خلاف اس کا دل تعصب سے بھرا ہوا تھا۔ البتہ لباس اور عادات کے لحاظ سے وہ ترقی پسند ہندو تھا۔ وہ تھرڈ ایئر تک پڑھا تھا۔ بی۔ اے اس لئے نہ کر سکا کہ اس کا باپ مر گیا تو کاروبار سنبھالنے والا کوئی نہ رہا۔ یہ دُور دور تک پھیلا ہوا آڑھت کا کاروبار تھا۔ مقتول تعلیم ترک کر کے آگیا اور اس نے تجارت سنبھال لی۔ اس کے بعد اس نے شادی کی۔ اس کے دو بچے تھے۔

رات غالباً دس گیارہ بجے کے درمیان کا وقت تھا۔ دوسرے روز ہندو تھانے میں یہ اطلاع لے کے آئے کہ ایک اندھیری گلی میں سیٹھ راجیش مرا پڑا ہے۔ ان ہندوؤں کے ساتھ غریب سا ایک آدمی تھا جس نے لاش دیکھی اور ان ہندوؤں کو اطلاع دی تھی۔ میں یہ دعائیں کرتا لاش تک پہنچا کہ یہ قتل نہ ہو، راجیش حرکت قلب بند ہونے سے مر گیا ہو ہندوؤں کی آلپ میں کاروباری تباہی ہو کر لے تھی، قتل تک کہیں نہ بت نہیں آتی تھی۔ البتہ یہ خطرہ نظر آرہا تھا کہ اس نے کسی سیکھ یا مسلمان سے دشمنی منول لے لی ہو گی۔ مسلمان اور سیکھ انتہائی کارروائی کرنے والی قومیں ہیں۔

## لاش، ایک بال اور لب سٹک

میں نے تھانے میں لاش کا منظر ہی معائنہ کیا۔ گردن کے گرد پھندے کا نشان صاف تھا۔ مقتول نے گرم کپڑے کی قمیض اور اسی کپڑے کا پاجامہ پہن رکھا تھا۔ قمیض کے بٹن چاندی کے تھے۔ یہ سٹڈ بٹن تھے۔ جب میں سے چاندی کی زنجیر گزری ہوئی تھی۔ اُس دور میں اس قسم کے بٹن استعمال ہوتے تھے۔ کار سے نیچے والے بٹن اور اس کی زنجیر کے ساتھ ایک بال اُلجھا ہوا تھا۔ یہ ٹوٹا ہوا مٹکلیا بال تھا۔ اس میں کسی شک کی گنجائش نہیں تھی کہ یہ عورت کا بال ہے۔ بٹن سے کچھ آگے اور بائیں طرف مجھے ایک داغ کا شک ہوا۔ قمیض کا رنگ سلیٹی تھا۔ میں نے داغ کو غور سے دیکھا۔ یہ سُرخ تھا اور یہ لب سٹک کا ہی ہو سکتا تھا۔ بہت مدہم تھا۔ میں نے اتنی زیادہ اس داغ کے قریب آنکھیں کیں کہ میری ناک قمیض سے جا لگی۔ مجھے گلاب کے عطر کی خوشبو آتی۔

میرا اِس۔ اے۔ آئی عثمان نام کا ایک مسلمان تھا پہلے بھی ایک کہانی میں اس کا ذکر کر چکا ہوں۔ بہت دلیر اور ذہین جوان تھا۔ اگر زندہ رہتا تو اُس پکڑ چڑل کے عہد سے تک پہنچتا لیکن ڈاکوؤں کے ساتھ ایک جھڑپ میں وہ مجھے بچاتے ہوئے مارا گیا تھا۔ اِس کی کہانی سنا چکا ہوں وہ یاد آتا ہے تو آج بھی میرے اُسٹوکل آتے ہیں۔ وہ زندہ دل بلکہ

عناش طبیعت کا مالک تھا۔ میں نے اُسے کہا کہ وہ بھی سونگھے۔ اُس نے سونگھا تو نئے کی سی کیفیت میں آنکھیں بند کر لیں۔ میں نے پوچھا۔ یہ گلاب کے عطر کی خوشبو نہیں؟

”نہیں!“ اُس نے غمور لہجے میں کہا۔ ”یہ کسی حیدرہ دلربا کی بو ہے ملک صاحب! یہ ارمان بھرے رومانوں کی بو ہے۔“ میں نے اُس کے سر پر ہتھیر مار کر ارمان بھرے رومانوں سے بیدار کیا تو اُس نے ہنس کر کہا۔ ”جی۔ یہ گلاب کا عطر ہے۔ یہ لب سٹک کا ہلکا سا داغ ہے اور یہ اُسی کا بال ہے جو گلاب کا عطر اور لب سٹک لگاتی ہے۔۔۔۔۔ ملک صاحب!“ اُس نے حسبِ عادت زندہ دلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ ”یہ نفیثیں مجھے دے دیں۔“

رومان پرستی عثمان کی کمزوری تھی۔ وہ جلد ہی ہی سنجیدہ مُوڈ میں آ گیا۔ میں نے مقتول کی قمیض آگے سے پھاڑ کر اُتار لی اور باقاعدہ کاغذی کارروائی کر کے اسے اپنے قبضے میں لے لیا۔ میں نے آپ کو متعدد کہانیوں میں بتایا ہے کہ عام آدمی کو نظر نہ آنے والی چیزیں پولیس کے لئے بڑی قیمتی ہوتی ہیں۔ لب سٹک کا داغ اتنا مدہم تھا کہ میرے سوا اور کوئی نہ دیکھ سکتا۔ میں نے قمیض کو ہر جگہ سے سونگھا۔ عطر کی خوشبو صرف وہاں تھی جہاں کسی عورت کا بال اور سُرخ داغ تھا۔ یہ بال اور لب سٹک مقتول کی اپنی بیوی کی بھی ہو سکتی تھی۔ لاش کو اچھی طرح دیکھا، کہیں کوئی چوڑ یا زخم نہیں تھا۔ پھر میں نے اپنے ایک تجربے کی بناء پر

لاش کی انگلیاں اور ناخن دیکھے۔ ناخن بڑھے ہوئے تھے۔ درمیانی انگلی اور اس کے اور انگوٹھے کے درمیان والی انگلی کے ناخنوں کے اندر کی طرف اور انگلیوں کے سروں پر خون جما ہوا تھا۔ اس سے یہ سراغ ملا کہ جب اس کی گروں کے گرد پھندا ڈال کر کسا گیا تو اُس نے پھندا ڈالنے والے کے ہاتھ یا بازو پر آزاد ہونے کے لئے ناخن مارے اور اُس کی کھال چھیل دی۔ مجھے ابھی یہ معلوم نہیں تھا کہ پھندا کیسا تھا۔ یہ رستہ تھا یا چھوٹی سی رستی تھی۔ بہر حال یہ یقین تھا کہ ہاتھوں سے گلا نہیں گھونٹا گیا۔ لاش پوسٹ مارٹم کے لئے بھجوا دی۔ سرکاری ہسپتال قریب اسی تھا۔ رات کے بارہ بج چکے تھے۔ عثمان کو ساتھ بھیجا تاکہ وہ ڈاکٹر کو جگا کر فوراً پوسٹ مارٹم کراتے۔ میں نے ابتدائی بیان لینے شروع کئے۔ جس آدمی نے لاش دیکھی تھی اُس سے بہت کچھ پوچھا۔ اُس نے بتایا کہ جب اُس نے لاش دیکھی تو اُس نے پاس بیٹھ کر لاش کے منہ پر اور ہاتھوں پر پٹا بٹھا کر مسموم تھا اس لئے وہ سمجھا کہ وہ زندہ ہے۔ اُس نے باپس جلائی تو لاش کا چہرہ دیکھ کر ڈر گیا۔ اُس نے مقتول کو پہچان لیا اور قریبی گھر کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ ایک آدمی باہر آیا۔ اُس نے لاش دیکھ کر شور مچا دیا۔ کئی لوگ نکل آئے۔ مقتول کے گھر اطلاع دی گئی۔ وہ چونکہ دولتمند تاجر اور لیڈر تھا اس لئے ہر طرف شور مچا ہو گیا اور یہ سرکہ وہ ہندو تگتے جو تھانے میں آئے تھے۔ وہ اب بھی تھانے کے برآمدے میں بیٹھے تھے۔ مقتول کے لہا حقین بھی موجود تھے۔

لاش گرم ہونے سے میں نے یہ رائے قائم کی کہ اسے ایک گھنٹہ پہلے قتل کیا گیا ہے۔ وہ ایک قصبہ تھا جہاں شام کے فوراً بعد وہاں بند ہو جاتی تھیں اور لوگ جلدی سو جاتے تھے۔ موسم سردیوں کا تھا۔ لوگ گھروں میں دبکے ہوئے تھے۔ گلی اندھیری تھی۔ وہاں نو بجے یا اس سے ذرا بعد قتل ہو جانا کوئی عجوبہ نہیں تھا جس آدمی نے لاش دیکھی تھی اُسے میں نے اس قابل نہ سمجھا کہ اس پر شک کیا جائے۔

اُسے باہر بھیج کر دونوں ہندوؤں کو اندر بلایا۔ انہوں نے بتایا کہ مقتول شام کے بعد اُن کے ساتھ تھا۔ مندر میں ایک میٹنگ تھی۔ یہ میٹنگ کوئی ایک گھنٹہ رہی، پھر سب اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے۔ میں نے اُن سے پوچھا کہ انہیں یقین ہے کہ مقتول میٹنگ کے بعد اپنے گھر چلا گیا تھا؟ ان میں سے ایک نے ذرا سوچ کر کہا ”وہ ہم سے الگ ہوا تو اُس کا رخ اپنے گھر کی طرف نہیں تھا۔“

”آپ مجھے کوئی اشارہ دے سکتے ہیں کہ اور کس کے ساتھ اُس کی دوستی تھی؟“ میں نے پوچھا۔

”وہ تو ہر کسی کا دوست تھا۔“ ایک ہندو نے جواب دیا اُس نے دوسرے ہندو کی طرف دیکھا۔ دوسرے نے اُس کی طرف دیکھا۔ انہیں معلوم نہیں تھا کہ وہ اُس تھا نیدار کے سامنے بیٹھے ہیں جو آنکھوں سے دل کی بات جان لیا کرتا ہے۔ میں نے انہیں کہا ”آپ مجھ سے کچھ چھپانے کی کوشش نہ کریں۔ مجھے ذرا سا بھی شک ہوگا کہ آپ

ہوئے کہا۔ ”اُس کا دل کہیں اور تھا۔ میری بیٹی تو بس اس کے بچوں کی ماں تھی۔“

میں چونکا اور اس سے پوچھا کہ وہ کیا کہہ رہا ہے؟ اس نے اُسی سکھ کا نام لیا جس کا ذکر دونوں ہندو کر گئے تھے۔ اس نے بتایا کہ اس سکھ کی ایک جوان بیٹی شادی شدہ ہے لیکن گھر بیٹھی ہوتی ہے۔ خاوند کے ساتھ اس کی بن نہیں سکی۔ مقتول اس سکھ کے گھر زیادہ جاتا کہ تاتھا میں نے سسر سے پوچھا کہ اُسے کس طرح یقین ہے کہ مقتول سکھ کی اس بیٹی میں دل چسپی لیتا تھا؟ وہاں جانے کی کوئی اور وجہ بھی ہو سکتی تھی۔ سسر کوئی ثبوت پیش نہ کر سکا سوا اس کے کہ مقتول اپنی بیوی سے کچا کھا رہا تھا۔

جس سکھ کا اُس نے اور دونوں ہندوؤں نے نام لیا تھا وہ کوئی معمولی سا آدمی نہیں تھا۔ وہ بھی مقتول کی طرح بہت بڑا تاجر تھا قلعے کی طرح اُس کی حویلی تھی۔ وہ بھی صرف تاجر نہیں بلکہ لیڈر قسم کا آدمی تھا۔ سرکاری اور سیاسی حلقوں میں اُس نے نام پیدا کر رکھا تھا۔ مقتول کا سسر مجھے کوئی اور بات نہ بتا سکا۔ اُس کی بیٹی جب اُس کے پاس یعنی اپنے میکے جاتی تھی تو اپنے خاوند کی بے رحمی کی شکایت کیا کرتی تھی .... سسر کو رخصت کر کے مقتول کے چھوٹے بھائی کو ملا یا۔ اُس نے بھی کہا کہ مقتول کی کسی کے ساتھ دشمنی نہیں تھی۔ سکھ کی دوستی کے متعلق اُس نے بتایا کہ سکھ کا ایک جوان اور شادی شدہ بیٹا ہے۔ مقتول کی زیادہ دوستی اس

کچھ چھپا رہے ہیں تو آپ گھروں کو نہیں جاسکیں گے۔“  
ہندو بڑی عیار اور مکار قوم ہے۔ وہ فوراً میرے آگے بھینے لگے۔ ان کی حرکتیں غور شاہی درباریوں کی طرح تھیں۔ اُنہوں نے بتایا کہ چھپانے کی کوئی بات نہیں۔ ایک سکھ کا نام لے کر اُنہوں نے بتایا کہ وہ اُس کے گھر جایا کرتا تھا۔ شاید ادھر ہی گیا ہو گا۔ ان سے پوچھا کہ کسی کے ساتھ اس کی اتنی دشمنی تھی کہ قتل تک نوبت پہنچتی؟ مجھے جواب ملا کہ وہ ہر دلعزیز تھا۔ دشمنی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ان سے کچھ اور معلومات لیں اور رخصت کر دیا۔

## ایک بیوی اپنی ایک پرانی

مقتول کے لواحقین بھی آتے بیٹھے تھے۔ ان میں اس کا سسر بھی تھا اور اس کا ایک چھوٹا بھائی بھی جس کی عمر بیس سال سے زیادہ تھی۔ میں نے سسر کو اندر بلا یا۔ بوڑھے کی حالت بہت بُری ہو رہی تھی۔ اس کی بیٹی بیوہ ہو گئی تھی۔ اُس سے پوچھا کہ مقتول کی کسی کے ساتھ دشمنی تھی؟ اُس نے لاعلمی کا اظہار کیا۔ وہ روتا زیادہ اور باتیں کم کرتا تھا۔ میں نے اُس سے ہمدردی کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ اس کی بیٹی جوانی میں ہی بیوہ ہو گئی ہے۔

”وہ تو اُس کی زندگی میں بھی بیوہ ہی تھی۔“ اس نے روتے



کے ساتھ تھی۔

”تمہارے بھاتی اور بھابی میں کبھی لڑائی جھگڑا ہوا تھا؟“ میں نے پوچھا۔ ”تمہارے بھائی کا اُس کے ساتھ کیسا سلوک رہتا تھا؟“ ”میری بھائی لڑنے جھگڑنے والی عورت نہیں۔“ اُس نے جواب دیا۔ ”میرا بھائی اُس کے ساتھ زیادہ بولتا چلتا نہیں تھا۔“ ”رات دیر سے گھر آتا تھا؟“

”اکثر دیر سے آتا تھا۔“

”اس سکھ کے گھر چلا جاتا ہوگا؟“ میں نے کہا۔ ”تمہیں بھی کچھ شک ہوا ہوگا۔“ وہ گہرا رہا تھا۔ خاموش رہا۔ میں نے اسے بڑے نرم لہجے میں کہا۔ ”تمہارا بھائی قتل ہو گیا ہے۔ مجھے قاتل کو پکڑ کر سزائے موت دلانی ہے۔ کیا تم پسند نہیں کرو گے کہ تمہارے بھائی کے قاتل کو سزا ملے؟.... مجھ سے کچھ نہ چھپاؤ۔ میری مدد کرو۔ تم سکھ کی اُس بیٹی کے متعلق کیا جانتے ہو جو اپنے خاوند کے پاس نہیں رہتی؟“ ”وہ بہت خوبصورت ہے۔“ اُس نے جواب دیا۔

”تمہاری بھابی سے زیادہ خوبصورت ہے؟“

”نہیں۔“ اُس نے جواب دیا۔ ”میری بھابی بد صورت تو نہیں۔ فرق یہ ہے کہ میری بھابی سادہ طبیعت کی ہے اور بولتی کم ہے۔ بیکہ کی بیٹی بہت شوخ اور ہنس مکھ ہے۔“ اس لڑکے کو میں نے اپنے ساتھ بے تکلف کر لیا۔ اُس وقت

اُسے ہمدردی کی ضرورت تھی جو میں نے دی۔ اُس کی جھجک دُور ہو گئی۔ میں نے اُس سے پوچھا کہ اُس کی بھابی بنی تھنی نہیں رہتی کہ اُس کا بھاتی خوش رہتا؟ اس نے وہی جواب دیا کہ اُس میں سادگی زیادہ ہے۔ اس نے میک اب کبھی نہیں کیا۔ سکھ کی بیٹی کے متعلق اُس نے بتایا کہ وہ تو ہر وقت میک آپ کتے رکھتی ہے۔

اُس رات تفتیش یہیں پر ختم کر دی۔ رات تھوڑی سی رہ گئی تھی۔ میرا شک سکھ پر پختہ ہونے لگا۔ یہ تو پہلے ہی میرے ذہن میں آگئی تھی کہ اگر وہ قتل ہوا ہے تو کسی سکھ یا مسلمان سے دشمنی مول لے بیٹھا ہو گا۔ میں آپ کو یہ بتانا بھول گیا ہوں کہ یہ کسی رہزن یا پیشہ ور چور کا بھی کام نہیں تھا کیونکہ اُس کی کلائی میں گھڑی، انگلی میں قیمتی انگوٹھی اور جیب میں خاصی رقم موجود تھی۔ میرے پاس ایک ہی سراغ تھا کہ قاتل کے ہاتھ، بازو یا چہرے پر خراش کا گہرا نشان ہوگا۔ مقتول کے ناخنوں نے اُس کا غول نکال لیا تھا۔ یہ بھی یقین ہو چکا تھا کہ قتل کا باعث عورت ہے۔

عطر اور بال والی کوئی اور تھی

صبح پوسٹ مارٹم رپورٹ ملی۔ مقتول کو باریک رستی سے پھندا ڈال کر مارا گیا تھا۔ جسم پر کوئی اور زخم یا چوڑ نہیں تھی۔ پیٹ میں جو کھانا گیا تھا، اس سے ڈاکٹر نے لکھا کہ وہ کھانے کے تھوڑی سی دیر بعد



وہ بال اس عورت کا نہیں۔ اس کے بال بالکل سیاہ تھے اور وہ بال سیاہی  
مائل بھورے تھے۔ اس بال والی عورت کا رنگ گورا ہونا چاہیے تھا۔ بیوہ کا  
رنگ گندمی تھا۔

مجھے یہ بھی دیکھنا تھا کہ بیوہ گلاب کا عطر لگاتی ہے اور کیا گزشتہ رات  
اُس نے عطر لگایا تھا؟ میں اُسے قریب ہو کر سونگھ تو نہیں سکتا تھا۔ باتوں  
باتوں میں مجھے ایک بہانہ مل گیا۔ وہ روتے جا رہی تھی۔ میں نے ہمدردی  
سے اُس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور ہاتھ سونگھا۔ صرف تیل کی بو تھی اور یہ کوئی  
اچھی قسم کا تیل نہیں تھا۔ ذرا دیر بعد میں اُس کے قریب ہو گیا اور ہمدردی  
کے لیے تانہ "اظہار کے لئے اُسے اپنے ساتھ لگا لیا۔ وہ جھنپ کر  
پر سے ہٹ گئی میری ناک اپنا کام کر چکی تھی۔ مجھے اس کے کپڑوں سے  
کسی قسم کے عطر کی خوشبو نہ آئی۔ اُس کے ہونٹوں کو دیکھا۔ لب شک  
کا نام نشان نہیں تھا۔ یہ تو مقتول کا بھاتی مجھے بتا چکا تھا کہ اس عورت  
نے کبھی میک اپ کیا ہی نہیں۔

اس مشاہدے سے مجھے یقین ہو گیا کہ لاش کے ساتھ بال اس  
عورت کا نہیں کسی دوسری عورت کا ہے۔ میں نے اُس سے پوچھا کہ اُسے  
ایسا شک ہے کہ اُس کے خاوند کی دل چسپی اور عورت میں کتنی؟ اُس  
نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ دراصل وہ رواں تھی عورت تھی جو خاوند کے خلاف  
ہزار شکاتوں کے باوجود زبان نہیں کھولتی۔ ہندوؤں کی بیویوں میں  
یہ وفاداری زیادہ ہوا کرتی تھی۔ میں نے یہ اندازہ لگایا کہ اگر اسے اپنے

مرا ہے۔ مرنے کا جو اندازہ وقت لکھا گیا وہ اُس وقت سے ڈیڑھ ایک  
گھنٹہ پہلے کا تھا جب لاش تک میں پہنچا تھا۔ اُس وقت تک لاش سرد ہو  
چکی تھی۔

میرا مخبری کا نظام بہت اچھا تھا۔ اس میں دو عورتیں بھی تھیں۔  
عثمان نے ان سب کو ہدایت دے کر سرگرم کر دیا تھا۔ یہ لوگ زمین کی  
متر سے بھی خبریں نکال لاتے تھے۔ میں مقتول کے گھر چلا گیا۔ یہ اونچے درجے  
کا خاندان تھا۔ میں نے کسی عورت کو تھانے بلانا مناسب نہ سمجھا۔ مقتول  
کی بیوی کو علیحدگی میں بٹھالیا جو ان عورت تھی۔ خوبصورت بھی تھی۔ اس  
پر مجھے یہ افسوس ہوا کہ اسے ساری عمر بیوہ رہنا تھا۔ ہندو بیوہ دوسری  
شادی نہیں کر سکتی۔ مقتول کی لاش ابھی گھر میں پڑی تھی۔ میں نے مقتول  
کی بیوہ سے اظہار ہمدردی کیا اور پوچھ گچھ شروع کر دی۔ وہ کوئی تفصیلی  
اور واضح جواب نہیں دیتی تھی۔ سر ہلا دیتی تھی یا دھیمی آواز میں ہاں یا نہ  
کہہ دیتی تھی۔ یہ اس کی عادت بھی تھی اور میوگی کے غم کا اثر بھی۔

میں نے اُس سے بہت کچھ پوچھا۔ اہم سوال یہ تھے کہ مقتول کا  
اُس کے ساتھ روٹیہ اور سلوک کیا تھا۔ اُس نے کتنی بار پوچھنے کے بعد  
کہا کہ وہ مر گیا ہے، میں کچھ نہیں کہوں گی۔ میں نے اُس سے یہ مطلب لیا  
کہ روٹیہ اور سلوک اچھا نہیں تھا۔ میں نے وہ بال بڑی ہی غور سے دیکھا  
تھا جو لاش کے بٹن اور ٹخنوں کی زنجیر میں پھنسا ہوا تھا۔ میں نے بیوہ  
کے بالوں کو غور سے دیکھا اور اپنے تجربے کی بنا پر یہ رائے قائم کی کہ

خاوند کے خلاف کوئی شکایت نہ ہوتی تو وہ زور دے کر کہتی کہ اُسے خاوند کے خلاف کوئی شکایت نہیں تھی۔ اُس کی خاموشی اور جواب دینے اور نہ دینے کا انداز بتا رہا تھا کہ وہ خاوند سے خوش نہیں تھی۔ یہ مجھے اس کا باپ پہلے ہی بتا چکا تھا کہ اس کی بیٹی کے ساتھ مقتول کا رویہ ٹھیک نہیں تھا۔

”تمہارا خاوند شام کو کھانا کھا کر گیا تھا؟“

”نہیں۔“ اُس نے جواب دیا۔

”جانتے وقت کہہ گیا تھا کہ کھانا واپس آ کر کھاؤں گا؟“

”نہیں۔“

”وہ گوشت کھانا تھا؟“

اُس نے چونک کر میری طرف دیکھا جیسے میں نے اُس کی توہین کر دی ہو یا کوئی انہونی بات کہہ دی ہو۔ ہندو گوشت نہیں کھاتے۔ آجکل شاید جدید ہندوؤں نے گوشت کھانا شروع کر دیا ہو۔ برہمن تو گوشت کی کُوس سے بھی بھاگتے ہیں۔ مقتول برہمن تھا جو ہندوؤں کی سب سے اونچی ذات ہے۔ اس کی بیوہ کو معلوم نہیں تھا کہ پوسٹ مارٹم میں اس کے خاوند کے معدے میں جو غذا دیکھی گئی تھی اس میں گوشت بھی تھا۔

”تمہیں معلوم تھا کہ تمہارا خاوند شراب پیتا ہے؟“

اُس کا رویہ عمل پہلے سے زیادہ شدید تھا۔ برہمن شراب نہیں پیتے۔ بیوہ نے کہا۔ ”آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ ہم برہمن ہیں۔ گوشت اور شراب

بھجوں مسلمانوں اور عیسائیوں کی غذا ہے۔ مجھ سے ایسے ناپاک سوال نہ کریں۔“

ڈاکٹر نے لکھا تھا کہ مقتول نے شراب بھی پی تھی۔ گوشت اور شراب سے میں اس نتیجے پر پہنچا کہ مقتول عیش و عشرت کا دلدادہ تھا اور اس سے میں نے یہ نتیجہ بھی اخذ کیا کہ اُس نے کچھ تاجر کے گھر کھانا کھایا اور شراب پی تھی۔ بیوہ چونکہ بھڑک اٹھی تھی اس لئے میں نے اس کے غصے سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی۔ میں نے کہا۔ ”کچھ بڑی ہی پانی قوم ہے! مہنوں نے تمہارے خاوند جیسے بچے برہمن کو بھی گوشت اور شراب سے ناپاک کر دیا ہے۔“

”آپ کو کیسے پتہ چلا ہے کہ اُس نے گوشت کھایا اور شراب پی تھی؟“

”اُس نے پوچھا۔ میں نے اُسے بتا دیا کہ مجھے کیسے پتہ چلا ہے اور کہا۔ ”تمہارے خاوند کو کچھ کی بیٹی نے خراب کیا اور کچھ کے بیٹے نے اسے قتل کیا ہے۔ کیا تم یہ پسند نہیں کرو گی کہ جس نے تمہارا سماگ اجاڑا ہے اُسے پھانسی دی جاتے؟“

”کچھ کی بیٹی کو بھی پھانسی دی جاتے گی؟“ اُس نے پوچھا۔

”تم کچھ بتاؤ تو میں اُسے بھی پھانسی دلوں گا۔“

”ہاں۔“ اُس نے دانت پیس کر کہا۔ ”اُسے پھانسی دلو۔ اُسی

نے مجھ سے میرا خاوند چھینا ہے۔“

میں نے تھانے جا کر عثمان کو سیکھ لڑکی کے خاوند کے گاؤں کا نام بتایا اور کہا کہ اس خاوند کو تھانے لے آتے اور وہاں کے نمبر دار اور چوکیدار سے پتہ کر آتے کہ یہ آدمی قتل کی رات گاؤں میں تھا یا کہیں باہر گیا تھا۔ عثمان کو معلوم تھا کہ یہ سرائے کس طرح لگایا جاتا ہے اور اسے کیا کرنا ہے۔ عثمان نے بتایا کہ اس گاؤں میں نمبر دار اور چوکیدار کے علاوہ دو مخبر موجود ہیں۔ عثمان وروسی آتا رہا کہ روانہ ہو گیا۔

رات کو میں سیکھ تاجر کے گھر چلا گیا۔ اُس کے ساتھ سنبھل کر بات کرنی تھی۔ ایک تو یہ بات ہی بڑی نازک تھی کیونکہ یہ اُس کی بیٹی کے متعلق تھی اور دوسرے وہ اپنے درجے کا آدمی تھا۔ اُس کے پاس بیٹھ کر کچھ دیر قاتلوں کے قتل پر افسوس ہوتا رہا۔ میں بھی اس کی تعریفیں کرتا رہا۔ باتوں کو گھما پھرا کر میں نے اُس کی بیٹی کی بات ہمدردی کے رنگ میں شروع کی۔ اُس کے خاوند کو بُرا بھلا کہا۔ آپ اتنے باعزت اور صاحب حیثیت ہیں، لڑکی ان جنگلیوں کو کیوں دے دی تھی؟۔ میں نے یہ بھی کہا۔ ”اگر آپ کہیں تو میں انہیں ایک دن میں سیدھا کر دوں۔“

اُس نے کوئی مجبورہی بتائی اور بولا۔ ”مجھے اپنی غلطی کا احساس بعد میں ہوا۔ بیٹی کو میں نے بڑے پیار سے پالا تھا۔ یہ شہری زندگی کی عادی تھی۔ دیہاتی ماحول میں دل نہ لگا سکی۔ دیہات میں کوئی معمولی کسان ہو یا بڑا زمیندار، طور طریقے سب کے ایک جیسے ہوتے ہیں۔ داماد کے متعلق بعد میں پتہ چلا کہ اچھے چال چلن کا نہیں۔ لڑکی گھر آکر روتی تھی۔ پھر

”تمہیں کس طرح یقین ہے؟“  
 ”وہ میرے ساتھ اُس کی خوبصورتی کی اور اُس کی عاتقوں کی توفیق کیا کرتا تھا۔ اُس نے جواب دیا۔ ”میں اُس کی منتیں کیا کرتی تھی کہ وہ میرے حال پر رحم کرے مگر اُس نے کبھی رحم نہ کیا۔“  
 ”تم نے اس لڑکی کو کبھی دیکھا ہے؟ کیسی ہے؟“  
 ”وہ اتنی خوبصورت نہیں جتنے نازخڑے کرتی ہے۔“ اُس نے جواب دیا۔ ”میں نے اُسے کئی بار دیکھا ہے۔ بدعاش لڑکی ہے۔ شریف ہوتی تو اپنے خاوند کے ساتھ روتی میرا خاوند مجھے پسند نہیں کرتا تھا بچہ بھی میں اس کے ساتھ بندھی رہی۔“  
 ”اُس کا خاوند اسی شہر میں رہتا ہے؟“  
 ”دیہات میں۔“ اُس نے ایک گاؤں کا نام لے کر کہا۔ ”بہت بڑے زمیندار کا بیٹا ہے۔ اُن کے باغ باغیں ہیں۔ وہ بہت دولت مند لوگ ہیں۔“

## بیٹی اور نیا شک

اس انکشاف سے مجھے ایک اور شک ہوا۔ وہ یہ تھا کہ اس سیکھ لڑکی کے خاوند کو پتہ چل گیا ہو گا کہ مقتول کا میل جول اُس کی بیوی کے ساتھ ہے قتل اسی نے کیا یا کر یا ہو گا۔ مجھے اس خاوند کو بھی شامل تفتیش کرنا تھا۔

بیٹھ ہی گئی۔ میں نے بھی اسے واپس بھیجنا پسند نہ کیا۔ ڈیڑھ سال ہو گیا ہے  
”سسرال کی طرف سے کوئی لینے نہیں آیا؟“

”دوبارہ سمجھوتے کے لئے آتے تھے۔“ اُس نے جواب دیا۔ ”لیکن  
سمجھوتہ ہونے لگا۔ وہ لوگ دھمکیاں دیتے تھے۔“

”کسی دھمکیاں؟“ میں نے پوچھا۔ ”کوئی ایک بتاتیں۔“

”مثلاً ایک بار، کوئی چار مہینے گزرے میرا داماد آیا تھا۔“ اُس نے  
جواب دیا۔ ”بحث مباحثہ ہوتا رہا۔ میری بیٹی نے اُس کے ساتھ جانے  
سے انکار کر دیا۔ وہ میری بیٹی کے کمرے میں چلا گیا۔ بیٹی نے مجھے بعد  
میں بتایا کہ وہ یہ الفاظ کہہ گیا ہے کہ جس کسی کو تم نے شہر میں یا رہنا رکھا  
ہے اُسے میرے ہاتھوں سے بچا نہیں سکو گی۔ پچھلے اُسے قتل کروں گا،  
پھر تمہیں اس طرح غائب کروں گا کہ کسی کو متہدی ہو بھی نہیں ملے گی۔“

”کیا آپ میرے اس شک کی تائید کریں گے کہ سیٹھ راجیش کا قاتل  
آپ کا داماد ہے؟“ میں نے پوچھا۔ ”اور کیا آپ پسند نہیں کریں گے  
کہ میں اُسے سزا دے موت دلا کر آپ کی بیٹی کو اس سے ہمیشہ کے لئے  
نجات دلا دوں؟“

اُس کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ اُس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آتی  
اور غائب ہو گئی۔ میں نے اُس کی دکھتی رنگ پڑی تھی مگر اُسے غالباً خیال  
آ گیا کہ اُس کی بیٹی بدنام ہو جائے گی۔ دھیمی سی آواز میں بولا۔ ”لیکن ملک  
مناجیب... لیکن راجیش کا میری بیٹی کے ساتھ تو کوئی تعلق نہیں تھا۔“

وہ تو میرے پاس آیا کرتا تھا۔ میرے بیٹے کے ساتھ بھی اس کی دوستی  
ایسی گہری تھی۔“

”میں نے آپ کی بیٹی پر تو کوئی شک نہیں کیا۔“ میں نے کہا۔  
”میں تو اس گھر کو بڑا ہی عزت دار اور شریف گھرانہ سمجھتا ہوں۔ کہنے سے  
میرا مطلب یہ ہے کہ سیٹھ راجیش کا آپ کے ہاں بہت آنا جانا تھا۔ ویسے  
بھی وہ خوبصورت جوان تھا۔ آپ کسی کی زبان بند نہیں کر سکتے۔ آپ کے  
دشمن بھی ہیں اور کاروبار میں حسد کرنے والے بھی ہیں۔ مجھے معلوم ہے  
کہ لوگ آپ کے گھر کے متعلق بھروسہ کرتے رہتے ہیں۔ کسی نے آپ کے  
داماد تک سیٹھ راجیش کے متعلق بے بنیاد باتیں پنپا دی ہوں گی۔ مجھے  
معلوم ہے کہ وہ آپ کے پاس آیا کرتا تھا۔ قتل کی رات بھی وہ مندر کی  
میٹنگ کے بعد آپ کے ہاں آیا تھا۔ اُس نے کھانا آپ ہی کے ساتھ  
کھایا ہو گا؟“

”جی ہاں۔“ سیٹھ نے جواب دیا۔ ”وہ کبھی کبھی میرے ہاں کھانا کھایا  
کرتا تھا۔“ اُس نے مسکرا کر کہا۔ ”پر تین گوشت نہیں کھاتے، شراب  
بھی نہیں پیتے۔ راجیش ان پابندیوں سے آزاد تھا۔ ویسے مذہب کا بڑا  
پکڑا تھا۔ وہ گوشت اور شراب کے لئے میرے ہاں کھانا کھاتا کرتا تھا۔“  
میں نے اُس سے پوچھا کہ وہ اُس کے گھر کس وقت آیا اور کس وقت  
گیا تھا۔ ان اوقات کے مطابق میں نے اپنے کچھ اندازے لگاتے میرے  
دہن میں جڑم کا خاکہ کیوں بننا تھا کہ قاتل اس کے نقاب میں تھا۔ وہ جب

اندھیری لگی میں پہنچا تو قاتل نے اُس کے گلے میں رستی ڈال کر چھیندا تنگ کر دیا۔ یہ خیال بھی میرے دماغ میں آیا کہ دیہاتی سکھ اور مسلمان اس طریقے سے قتل نہیں کیا کرتے۔ وہ کھڑی یا برجھی استعمال کیا کرتے ہیں لیکن یہ کوئی اہم سہلہ نہیں تھا۔ گلیاں بچی تھیں اس لئے کھرا ملنا ناممکن تھا۔

سکھ تاجر سے رخصت ہوتے ہوئے میں نے اُسے کہا کہ میں اُس کے بیٹے کو اپنے ساتھ لے جانا چاہتا ہوں۔ وہ ذرا گھبرایا میں نے کہا ”مقتول کی دوستی آپ کے بیٹے کے ساتھ زیادہ بھتی۔ میں اس سے مقتول کے متعلق کچھ پوچھوں گا۔ آپ کسی قسم کی پریشانی نہ کریں۔ مجھے آپ کی عزت کا پورے پورے خیال ہے۔“

میں اُسی وقت اس کے بیٹے کو اپنے ساتھ تھانے لے گیا۔

### دوستی کا رنگ کچھ اور نکلا

راستے میں اس کے ساتھ باتیں کرتا رہا۔ یہی باتیں میں اس کے باپ سے کہہ سُن آیا تھا۔ یہ جوان اور شادی شدہ آدمی تھا۔ اپنے مخصوص انداز سے میں نے اسے اپنے ساتھ بے تکلف کر لیا۔ اپنی بہن کے متعلق اس نے بتایا کہ زندہ دل لڑکی ہے۔ یہ اس کے باپ کی غلطی تھی کہ ذات برادری کے چکر میں اگر دیہاتیوں کے گھر رشتہ دے دیا۔ اس سے

پتہ چلا کہ اس کی بہن نے دیہات کا ماحول بھی قبول نہ کیا اور خاوند کو بھی پسند نہ کیا۔ میں ذاتی طور پر جانتا تھا کہ ایک زندہ دل لڑکی کے لئے خواہ وہ سکھ ہی ہو ایک سکھ کو قبول کرنا ذرا مشکل ہوتا ہے۔ سر کے لمبے بالوں اور وارطی کو پسند کرنا آسان نہیں ہوتا۔ میں نے کئی روشن خیال اور زندہ مزاج سکھ لڑکیاں سکھ خاوندوں سے بھاگی ہوئی دیکھی ہیں۔ یہ لڑکی اسی قسم کی معلوم ہوتی تھی۔ میں نے ابھی اسے دیکھا نہیں تھا، دیکھنا تھا۔ مقتول کے متعلق اس نے بتایا کہ وہ اچھی شکل و صورت کا لڑکا تھا ہی وہ ہنس مکھ اور ملنسار بھی تھا۔ اس بھاتی نے میری باتوں کے گورکھ دھندے میں آکر میرے ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے یہاں تک بتا دیا کہ اس کی بہن مقتول کو بہت پسند کرتی تھی اور کبھی کبھی مقتول اس کی بہن کے کمرے میں بھی چلا جاتا تھا۔ گھر میں زیادہ آنے جانے کی وجہ سے اس کی بہن اور مقتول کے درمیان بے تکلفی بھی تھی۔

”کیا یہ ممکن ہو سکتا ہے کہ تمہارے اس دیہاتی بہنوتی کو اس بے تکلفی کا علم ہو گیا ہو؟“ میں نے پوچھا۔

”میں کچھ کہہ نہیں سکتا۔“ اس نے جواب دیا۔ ”کسی نے اُسے بتا دیا ہو گا۔“ کیا آپ کو یہ شک ہے کہ میرے بہنوتی نے سیٹھ کو قتل کیا ہے؟

”بڑا ایسا شک ہے۔“ میں نے کہا۔ ”کیا تمہارا بہنوتی اتنا دلیر ہے کہ قتل کر سکے؟“

اس گھر کے کمروں کی شکل و صورت ایسی تھی کہ کوئی کسی کمرے میں چلا جاتے تو کسی کو پتہ نہیں چلتا تھا۔ یہ تو میں بھی دیکھ آیا تھا۔ تلے جیسی حویلی تھی۔ میں نے اندرونی شکل و صورت ابھی طرح دیکھی تھی۔ اگر میں سمجھتا ہوں کہ کسی کمرے سے نکل کر کسی اور کمرے میں چلا جاتا تو کوئی بھی نہ دیکھ سکتا۔ منجبر عورت نے بتایا کہ مقتول جس روز اس گھر میں جاتا تھا اُس روز لڑکی کے چاقو چوہے بچلے کچھ اور ہی ہو کر تھے۔ ارد گرد کے لوگوں نے ان کے تعلقات کے متعلق چھ میگوئیاں شروع کر رکھی تھیں۔

میں پوری رپورٹ سن کر لڑکی کے بھاتی کے پاس جا بیٹھا اور پوچھا۔ ”کیا تمہیں سیٹھ راجیش اور اپنی بہن کا میل جول پسند تھا؟“ اُس نے ذرا اکھڑے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”ایسی تو کوئی بات نہیں تھی۔“

”بات بہت بڑی تھی۔“ میں نے کہا۔ ”اگر کوئی بات نہیں تھی تو بہن کو مارا بیٹا کیوں تھا؟“

”آپ کو کس نے بتایا ہے؟“

”میں جو پوچھ رہا ہوں اس کا جواب دو۔“ میں نے کہا۔ ”مجھے تمہارے گھر کی اتنی باتوں کا علم ہے جو تمہارے ماں باپ کو بھی معلوم نہیں.... اپنی بہن کو کیوں مارا تھا؟“

میرا ہلا ہوا لہجہ دیکھ کر وہ ڈر گیا۔ خالی خالی نظروں سے مجھے دیکھنے

”وہ وحشی آدمی ہے۔“ اس نے جواب دیا۔ ”وہ قتل کر سکتا ہے۔“

مجھے اس بھاتی پر بھی شک تھا۔ اسے مقتول کی اپنی بہن کے ساتھ اتنی زیادہ بے تکلفی پسند نہیں ہونی چاہیے تھی۔ میں اسی شک کی بنا پر اس سے باتیں کرنے لگا۔ اُس وقت ہم تھالے میں بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ عثمان واپس نہیں آیا تھا۔ ہیڈ کانٹیل نے برآمدے میں کھڑے ہو کر مجھے اشارے سے باہر بلایا اور پوچھا کہ یہ کون ہے؟ میں نے بتایا کہ سمجھتا ہوں کہ یہ ہیڈ کانٹیل نے کہا کہ ادھر آکر پہلے ایک رپورٹ سن لیں۔

کانٹیلوں کے کمرے کے پچھڑے میری ایک منجبر عورت کھڑی تھی۔ وہ اندھیرے میں دوسری طرف سے آئی تھی اور اُسی طرف سے اُسے جانا تھا۔ منجبروں کو چھپا کے رکھا جاتا تھا۔ اس عورت نے بتایا کہ سمجھ کی بیٹی خاوند سے ناراض ہو کر گھر بیٹھی ہے۔ یہ وہی رپورٹ تھی جو میں سن چکا تھا۔ نئی بات یہ پتہ چلی کہ لڑکی شو باز ہے۔ بال گوندھ کر نہیں بلکہ کھلے یا ڈھیلے ڈھالے رکھتی ہے۔ اُس دور میں کھلے بال سخت ناپسند کئے جاتے تھے۔ ایسی عورت کو شریف نہیں سمجھا جاتا تھا۔ منجبر عورت نے یہ بھی بتایا کہ اس لڑکی کا بھاتی (جو تھالے میں بیٹھا تھا) اپنی بہن کی عادلوں اور خاوند سے ناراضگی کو پسند نہیں کرتا تھا۔ دو مہینے بار بھاتی نے بہن کو مارا بیٹا بھی تھا۔ مقتول کو یہ لڑکی بہت چاہتی تھی اور وہ اسی کی خاطر اس کے گھر جایا کرتا تھا۔

لگا۔ میں نے اپنا سوال دہرایا تو اُس نے ڈرے ہوتے لہجے میں کہا  
 ”میں اُسے کہتا تھا کہ اپنے خاوند کے پاس چلی جاؤ۔“  
 ”تم مجھے اچھی طرح سمجھ چکے ہو کہ تمہیں بھی اُس کا خاوند اچھا نہیں  
 لگتا تھا۔“ میں نے کہا۔ ”تم نے یہاں تک کہا ہے کہ یہ تمہارے ماں  
 باپ کی غلطی تھی کہ اُنہوں نے تمہاری بہن کو جنگلیوں کے گھر بیاہ دیا۔۔۔  
 تم بہن کو کیوں خاوند کے گھر جانے کو کہتے تھے؟ بدنامی کا ڈر تھا؟  
 تمہاری بہن کا چین اچھا نہیں رہا تھا؟“

اُس کی زبان بند ہوگئی۔ میں نے کہا۔ ”بہن کو مارنے بیٹھنے کی  
 بجائے تم نے راجیش کو گھر آنے سے کیوں نہ منع کر دیا؟“  
 وہ بالکل ہی اکھڑ گیا۔ وہ تسلیم یافتہ جوان تھا۔ بڑی اچھی باتیں کرتا  
 تھا مگر اب جاہلوں کی طرح ادھر ادھر کی بیکار باتیں کرنے لگا۔ میں  
 نے اُس پر سوالوں کے تیر چلانے شروع کر دیے۔ وہ سمجھ گیا کہ میں  
 اُس پر قتل کا شک کر رہا ہوں۔

”آپ میرے بہنوئی پر قتل کا شک کیوں نہیں کرتے؟“ اُس نے  
 کہا۔ ”میں اس کا ثبوت پیش کرتا ہوں۔۔۔۔ میرا بہنوئی سمجھوتے کے  
 لئے اور میری بہن کو اپنے ساتھ لے جانے کے لئے آتا رہا لیکن دھمکیاں  
 دے کر چلا گیا۔ وہ شریفوں کی طرح بات کر ہی نہیں سکتا۔ ایک بار  
 وہ اپنے باپ کے ساتھ آیا تو سیٹھ راجیش بھی ہمارے گھر میں موجود تھا۔  
 میرے باپ نے اسے بھی بات چیت میں شامل کر لیا۔ راجیش نے

میری بہن کی طرف داری کی تو میرا بہنوئی غصے میں آگیا۔ جھگڑا بڑھ گیا۔ میرا  
 بہنوئی اور اُس کا باپ اکٹھے کر چل پڑے۔ میرے بہنوئی نے راجیش کو  
 پرے بلایا اور کچھ کہہ کر چلا گیا۔ راجیش نے ہمیں بتایا کہ میرا بہنوئی اُسے  
 کہہ گیا ہے کہ تمہاری زندگی کے دن تھوڑے رہ گئے ہیں۔ اس لڑکی کو  
 نے کہ تمہیں دو درپلے جاؤ۔ یہاں رہو گے تو زندہ نہیں رہ سکو گے۔ اس  
 سے پہلے وہ میری بہن کو یہ دھمکی دے گیا تھا کہ تم نے جسے یا رہنا رکھا  
 ہے اُسے مجھ سے بچا نہیں سکو گی۔“

”قتل کی رات تم کہاں تھے؟“ میں نے پوچھا۔

”میں اپنے ایک دوست کے گھر تھا۔“ اُس نے جواب دیا اور  
 دوست کا آنا پتہ بھی بتا دیا۔

## ایک اور بھید

میں اسی پر زور دیتا رہا کہ قاتل وہی ہے۔ مجھے ابھی لڑکی کے  
 خاوند سے بات کرنی تھی لیکن میں اپنا شک پوری طرح رفع کرنا چاہتا  
 تھا۔ میرے سوالوں سے تنگ آکر اُس نے کہا۔ ”میں آپ کو ایک  
 بات نہیں بتانا چاہتا تھا۔ آپ پولیس آفیسر ہیں، آپ پسند نہیں کریں گے۔  
 میں آپ کو بتانا چاہتا ہوں کہ راجیش کا میرے گھر میں آنا مجھے ناپسند نہیں  
 تھا۔ میری اور اس کی دوستی کسی اور مقصد کے تحت تھی۔“ اُس نے



ہماری وہ نسلیں جو جنگ عظیم دوم کے بعد پیدا ہوئی ہیں انہیں معلوم نہیں ہوگا کہ انڈین نیشنل آرمی کیا تھی، اس لئے میں ذرا اس کا تعارف کرادوں۔ جاپان نے جنگ عظیم کے دوسرے سال حملہ کر کے جاوا، سماٹرا، سنگاپور اور آج کے تمام تر انڈونیشیا پر قبضہ کر کے ایسی یلغار کی کہ برما پر بھی قابض ہو گیا۔ یہ انگریزوں کی بادشاہی کے علاقے تھے۔ آگے ہندوستان تھا۔ سبھاش چندر بوس بنگالی ہندو تھا۔ اس نے جاپانیوں سے ملاقات کی اور ہندوستان کے متعلق سودا بازی کر لی۔ ایک سکیم بنائی گئی جس کے تحت ان ہندوستانی افواج میں جو برما فرنٹ پر لڑ رہے تھے، پروپیگنڈہ کیا گیا کہ وہ ادھر سے بھاگ کر جاپانیوں کے مورچوں میں آجائیں اور انڈین نیشنل آرمی میں شامل ہو جائیں۔ ہندوستانی فوجی جو جاپانیوں کے پاس جٹی قیدی تھے ان میں سے بھی اس آرمی میں شامل کر لئے گئے۔

برما فرنٹ سے ہندوستانی فوجی بھگوڑے ہو کر جاپانیوں کے پاس جانے لگے۔ انہیں وہاں انڈین نیشنل آرمی جسے آئی۔ این۔ اے کہا جاتا تھا میں شامل کیا جانے لگا۔ سبھاش چندر بوس اس کا کمانڈر انچیف تھا۔ چند ایک کیپٹن جن میں ڈھلون اور شاہنواز قابل ذکر ہیں جنرل بن گئے۔ جاپانیوں کے ساتھ ہندو لیڈروں نے یہ سودا بازی کی تھی کہ جاپان ہندوستان پر فتح حاصل کر کے پورا ملک ہندوؤں کے حوالے کر دے گا۔ آئی۔ این۔ اے میں مسلمان افسر حمید ار اور جوان بھی جا

مجھ سے وعدے لینے شروع کر دیتے کہ میں اس کی یہ بات پولیس آفیسر کی حیثیت سے نہیں بلکہ ایک ہندوستانی کی حیثیت سے سنوں گا۔ میں نے وعدہ کیا کہ اس کی بات کا تعلق قتل سے نہ ہو، تو میں اسے راز رکھوں گا۔

اس نے جب بات شروع کی تو مجھے شک ہوئے لگا جیسے اسے معلوم ہی نہیں کہ میں مسلمان ہوں اور وہ تھانے میں بیٹھا ہے میں نے دراصل اس پر سوالوں سے حملہ کر کے اور اس پر قتل کا الزام عائد کر کے اس کی عقل مار دی تھی۔ وہ اپنے بچاؤ کے لئے ہاتھ پاؤں مار رہا تھا۔ بہر حال اس نے جوابات کی وہ میں آپ کو مختصر اُسنادیتا ہوں۔

”آپ ہندوستانی ہیں“ اس نے کہا۔ ”آپ انگریز کے ملازم ہیں لیکن آپ کی دلی وفاداری اس ہندوستان کے ساتھ ہوگی جو آزاد ملک تھا۔ اس پر پہلے مسلمانوں کا قبضہ رہا پھر انگریزوں نے قبضہ کر لیا۔

یہ آزاد ویس ہے۔ اسے آزاد کرانا آپ کا اور ہمارا فرض ہے۔ اب وقت آگیا ہے کہ ہم حرکت میں آئیں اور اپنے ملک کو آزاد کر لیں۔ آپ کو معلوم ہے کہ جاپان نے برما تک فتح حاصل کر لی ہے اور ہمارے وطن پرست فوجی افسروں نے انگریزوں کی فوج سے بھاگ کر اور جاپانیوں کے ساتھ مل کر انڈین نیشنل آرمی بنالی ہے۔ سبھاش چندر بوس ہمارے نیتا (لیڈر) ہیں۔ تیسٹرا، عیش اس خفیہ جماعت کا لیڈر تھا جو یہاں انڈین نیشنل آرمی کے لئے کام کر رہی ہے“

لانے والے یا دیس کو آزاد کرانے والے نوجوانوں میں اکثریت اُن کی ہوتی ہے جو جذباتی ہوتے ہیں۔ عقل کی بجائے جذبات سے راہنمائی لیتے ہیں۔ یہ سچ اسی قبیل کا جوان تھا۔ میں آتی۔ این۔ اے کی اصل حقیقت سے آگاہ تھا۔ یہ سچ مجھے ایک راز دے رہا تھا۔ میں نے اُس کے جذبات کو سراہا اور اُس کی باتوں کا ساتھ دینے لگا۔ وہ اور زیادہ دلیر ہو گیا۔ میری حوصلہ افزائی سے وہ پُر جوش تقریر کرنے لگا۔ آپ یہ بھی پیش نظر رکھیں کہ مارچ ۱۹۴۰ء میں قرارداد پاکستان منظور ہو چکی تھی اور اس کے تحت قوم کو دیتے گئے لائحہ عمل کو عملی جامہ پہنایا جا رہا تھا۔ مسلمان اب پاکستان سے کم کچھ بھی قبول کرنے پر آمادہ نہیں تھے۔ ہندوؤں نے اُسی وقت نظریہ پاکستان کے خلاف محاذ قائم کر لیا تھا اور سرگرم ہو گئے تھے۔

”میں تسلیم کرتا ہوں کہ ہندوستان میں ہندوؤں کے بعد اکثریت مسلمانوں کی ہے۔“ اُس نے کہا۔ ”لیکن وہ بہر حال اقلیت میں ہیں اس لئے انہیں ہندوستان کے کسی بھی حصے پر حکومت کا حق نہیں دیا جاسکتا۔ البتہ وہ ایک باعزت اقلیت سمجھیں جاتیں گے۔ ہندوستان پر حکومت کا حق صرف ہندوؤں کو حاصل ہے۔“

”تم سچے ہو۔“ میں نے پوچھا۔ ”تمہیں کیا ملے گا؟“  
 ”ایک سکھ ریاست۔“ اُس نے جواب دیا۔ ”آج کا ساہیوالہ پنجاب جس میں ریاستیں بھی شامل ہیں سکھ ریاست بن جاتے گی۔ ہندو لیڈروں کے

شامل ہوتے تھے۔ انہیں کچھ عرصہ بعد پتہ چلا کہ یہ ہندوؤں کی بلکہ کانگریس کی سکیم ہے جس کے تحت تمام تر ہندوستان پر ہندو راج قائم کیا جاتے گا۔ چنانچہ مسلمان ان سے الگ ہونے لگے۔

آئی۔ این۔ اے کو قی معمولی سی سکیم نہیں تھی۔ ہندوستان میں ہر کسی کی زبان پر آتی۔ این۔ اے کا نام تھا۔ انگریزوں کی نگاہ میں سبھاش چندر بوس

MOST WANTED PERSON

ہندوستان میں آتی۔ این۔ اے کے لئے زمین ہموار کرنے کے لئے نہیں دوزخ کام ہونے لگا تھا۔ اس آرمی کا انجام یہ ہوا کہ جاپان کو شکست ہوئی تو انگریزوں نے آئی۔ این۔ اے کے خود ساختہ جرنیلوں کو پکڑ لیا اور ان کے کورٹ مارشل ہوتے۔ سبھاش چند بوس جاپان میں ایک طیارے کے کریش میں مارا گیا۔ ہندو بہت عرصہ تک کہتے رہے کہ سبھاش چند بوس جسے وہ نیتاجی کہتے تھے، زندہ ہے اور ہندوستان کو آزاد کرانے آئے گا۔ یہ واضح ہو گیا تھا کہ آئی۔ این۔ اے ہندوستان سے مسلمانوں کو ختم کر کے پورے ملک میں ہندو راج قائم کرنے کے لئے بنائی گئی تھی۔

یہ سچ جو میرے بھانے میں بیٹھا تھا اسی انڈین نیشنل آرمی کی بات کر رہا تھا۔ اُس وقت برما کی جنگ زوروں پر تھی۔ یہ فرنٹ بہت ہی گرم تھا اور ہندوستان میں آئی داین۔ اے کے خفیہ گروہ سرگرم تھے۔ یہ سچ اسی گروہ کا لیڈر تھا۔ یہ میرا شاہدہ رہا ہے اور اب بھی ہے کہ انقلاب

کہا کہ وہ کسی اور سے اس کا ذکر نہ کرے اور اسے یقین دلا یا کہ میں اُسے گاڑیاں تباہ کرنے کے لئے ڈائنامیٹ مہیا کر دوں گا۔ وہ جب اتھانے سے نکلا تو بہت خوش تھا۔

## خاوند کا ارادہ خطرناک تھا

اگلے دن دیہات سے کچھ لٹکی کا خاوند آگیا۔ میں نے لٹکی کے بھاتی کے اُس دوست کو بھی اتھانے بلالیا جس کے متعلق اُس نے بتایا تھا کہ وہ قتل کی شام اُس کے گھر تھا۔ وہ ہندو تھا۔ اُس نے تصدیق کی کہ یہ کچھ اُس کے گھر تھا۔ میں نے کچھ کی طرح اس ہندو کو بھی ہمراہ لے کر دوست بنالیا۔ اُسے بھی ڈائنامیٹ مہیا کرنے کا وعدہ کیا۔ اُس نے کچھ سے زیادہ خوشی باتیں کیں۔ وہ تو مسلمانوں کو بہت ہی جلد ختم کرنے کو بے قرار تھا۔ اُس نے ایک اور دوست کی نشاندہی کی۔ مقتول ان کا لیڈر تھا۔ میرے پوچھنے پر اُس نے بتایا کہ وہ جاپانیوں کے باقاعدہ جاسوس نہیں ہیں۔ اسے بھی میں نے سختی سے کہا کہ وہ کسی سے ذکر نہ کرے کہ اُس نے میرے ساتھ یہ باتیں کی ہیں، ورنہ میں پکڑا جاؤں گا اور ان کی مدد کرنے والا کوئی نہیں رہے گا۔ وہ بھی کچھ کی طرح غشی سے پھولا ہوا اتھانے سے نکلا۔

کچھ لٹکی کے خاوند سے پوچھ گچھ شروع کی۔ عثمان یہ خبر لے آیا تھا

ساتھ سودا طے ہو چکا ہے۔ میں نے اس سے مسلمانوں کے متعلق پوچھا تو اُس نے رازداری سے کہا۔ ”مسلمانوں کو لکام ڈال کے رکھا جاتے گا۔ ہندو یہ کوشش ابھی سے کر رہے ہیں کہ مسلمان ہندو مذہب قبول کر لیں۔ اگر نہ کریں تو یہاں غلاموں کی طرح رہیں۔ انہوں نے پاکستان بنانے کا جوار ارادہ کیا ہے وہ ہم کبھی پورا نہیں ہونے دیں گے۔ اگر ملک کی تقسیم تک نوبت ابھی گئی تو ہم مسلمانوں کی قتل و غارت کریں گے اور پاکستان کو فوجی طاقت سے ختم کریں گے۔“

”دیں کو تم جیسے جو شیلے جوان ہی آزاد کر سکتے ہیں۔“ میں نے کہا۔ ”میں تمہارے ساتھ ہوں۔ پولیس میں رہ کر میں تمہاری جماعت کی بہت مدد کر سکتا ہوں۔ تمہاری خفیہ سرگرمیاں کیا ہیں؟ مجھے اپنی ضروریات بتاؤ۔“

”ہم آتی۔ این۔ اے کے لئے زمین ہموار کر رہے ہیں۔“ اُس نے جواب دیا۔ ”ہم یہاں تخریب کاری کریں گے۔ بڑے بڑے انگریز افسروں اور مسلمانوں کے لیڈروں کو خفیہ طریقوں سے قتل کیا جاتے گا۔ جب جاپانی فوج ہندوستان پر حملہ کرے گی تو ہم انگریزوں کی فوج کی ریل گاڑیاں اور اُن کے گولہ بارود وغیرہ کے گودام تباہ کریں گے۔ یہ اب چند دنوں کی بات ہے۔“

اُس نے میرے حال میں اگر نہایت نازک راز بتا دیے تھے۔ یہاں تک بتا دیا کہ اُس نے گھر میں کیا کیا اسلحہ رکھا ہوا ہے۔ میں نے اُسے سختی سے

کے ساتھ اُس کا دوستانہ تھا۔

”میں آپ کو سچ بتاؤں گا۔“ اُس کے رعب اور دلیری پر پانی پڑ گیا تھا۔ وہ کچھ ڈر بھی گیا تھا۔ کہنے لگا۔ ”میں نے قتل کا ارادہ ضرور کیا تھا لیکن اپنی بیوی کے قتل کا۔ میری بے عزتی کا باعث تو یہ عورت تھی۔ میں اُسے اغوا کر کے اور اُسے خوب خوار کر کے قتل کر دینے اور لاش غائب کر دینے کا ارادہ کرتے ہوئے تھا۔ سیٹھ کو قتل کرنے سے مجھے کیا حاصل ہوتا؟“

”جب تک یہ ثابت نہیں کر دو گے کہ تم اُس رات شہر میں نہیں آتے تھے میں تمہیں نہیں چھوڑوں گا۔“

”یہ میں آپ کو بتانے سے ڈرتا ہوں۔“ اُس نے کہا۔ ”میں شہر میں نہیں آیا تھا۔“ کچھ بھجک کر اُس نے شہر کے قریب کے ایک گاؤں کا نام لے کر کہا۔ ”کبھی کبھی وہاں جڑے کی بازی لگتی ہے۔ ہزاروں روپیہ ادھر ادھر ہو جاتا ہے۔“ اُس نے جوار یوں کے نام بھی بتا دیئے اور کہا۔ ”میں نے رات وہاں گزاری تھی۔“

میں نے سچ کو الگ بٹھایا اور اُن جوار یوں کو بٹھانے بلانے کا انتظام کیا جن کے نام اس سچھ نے بتاتے تھے۔ اس کی بیوی سے ملنا ضروری تھا۔ میں وردی اُتار کر سچھ تاجر کے گھر چلا گیا۔ وردی اُتار کو جانے کا سلب یہ تھا کہ میں لڑکی کے ساتھ تنہا ندری کے رعب میں نہیں بے تکلفی سے بات کرنا چاہتا تھا۔

کہ یہ سچھ قتل کی شام گاؤں سے کہیں چلا گیا تھا اور صبح واپس آیا تھا۔ میں نے اُس سے پوچھا کہ وہ اُس شام کہاں تھا۔ اُس نے جواب دیا کہ وہ اپنے گھر میں تھا۔ میں نے اُسے لپیٹ میں لینا شروع کر دیا۔ صاف پتہ چلتا تھا کہ وہ کچھ چھپا رہا ہے۔ وہ گاؤں سے غیر حاضر تھا۔ میں نے اُس کی بیوی کے متعلق بات کی تو اُس نے بتایا کہ اُس کے ہاں روپے پیسے کی کمی نہیں۔ بہت جاتا د اور اراضی ہے جو سونا اُگتی ہے۔ محل جیسی حویلی ہے لیکن اس محل کی کو گاؤں کا ماحول پسند نہیں تھا۔

”ایسا تو نہیں کہ وہ شہر میں کسی اور کو پسند کرتی ہو؟“

اُس نے مونچھوں کو تاؤ دے کر کہا۔ ”مجھ میں کیا کمی ہے کہ وہ کسی اور کو پسند کرے؟“

میں نے اُس سے اُن دھمکیوں کا ذکر کیا جو اُس نے اپنی بیوی اور مقتول کو دی تھیں۔ اُس نے صاف انکار کر دیا اور کہا کہ وہ تو اپنی بیوی کو اپنے گھر لانے گیا تھا مگر وہ رضامند نہ ہوتی۔ میں نے بہت طویل پوچھ گچھ کر کے کہا۔ ”تم گاؤں سے غیر حاضر تھے۔ کہاں گئے تھے؟“

”میں جہاں بھی گیا تھا اس سے آپ کا تعلق کیا ہے؟“ اُس نے رعب سے پوچھا۔

”تعلق یہ ہے کہ تم نے راجیش کو قتل کیا ہے۔“ میں نے کہا۔

”کہو تم نے یہ واروات نہیں کی۔ قتل کے بعد کہاں رہے؟ تم صبح کے وقت گاؤں گئے تھے۔ تم نے سیٹھ راجیش سے انتقام لیا ہے۔ تمہاری بیوی

## لڑکی جاسوس تھی

بیٹھا ہے۔ وہ تو اس قابل بھی نہیں کہ اسے تمہارا لڑکا رکھا جاتے۔  
”راجیش کو اُسی نے قتل کیا ہے۔“ اُس نے کہا۔ ”اُسے پھانسی  
چڑھائیں تو میرے دل کو سکون ملے گا۔“

میں نے چونکہ اُس کے حُسن کی تعریف کر دی تھی اس لئے اُس نے  
بالوں کو جھٹکے اور گردن کو خم دے دے کہ مجھ پر اپنے حُسن کا جادو  
چلانا شروع کر دیا۔ وہ واقعی شوباز لڑکی تھی۔ میں نے اس جادو کے اثر  
کو وقتی طور پر قبول کرتے ہوئے اُس کے جذبات کو اپنے قبضے  
میں لے لیا۔

”راجیش کے ساتھ تملہری ملاقاتیں کہاں ہوتی تھیں؟“  
”اسی کمرے میں۔“ اُس نے جواب دیا۔ ”کبھی باہر بھی ملاقات  
ہو جاتی تھی۔“

”قتل کی رات بھی وہ تم سے ملا تھا؟“

”پہلے میرے باپ کے پاس بیٹھا رہا۔“ اُس نے جواب دیا۔  
”وہاں سے اٹھا تو میرے کمرے میں آگیا۔“

”تمہارے بھائی بابا پ نے دیکھا تھا؟“

”نہیں۔“ وہ شرمگاہی اور بولی۔ ”کسی نے نہیں دیکھا۔ ہمارا گھر  
ایسا ہے کہ کوئی دیکھ نہیں سکتا۔“

”یعنی وہ تم سے چوری چھپے ملا کرتا تھا؟“

”زیادہ تر ملاقاتیں ایسی ہی ہوتی تھیں۔“ اُس نے کہا اور ایک

لڑکی کا باپ اپنے کام پر چلا گیا تھا۔ اُس کا بھائی گھر مل گیا تھاک  
سے ملا۔ میں نے اُس سے زیادہ تنگ کا مظاہرہ کیا۔ اُس کے ساتھ دس  
کی آزادی کی باتیں کر کے کہا کہ میں اُس کی بہن سے علیحدگی میں ملنا  
چاہتا ہوں۔ اُس نے مجھے اُس کے کمرے میں داخل کر دیا۔ لڑکی خوبصورت  
تھی۔ اُس کے بال بھورے اور کھلے ہوئے تھے۔ میں نے ایک نظر میں  
ہی پہچان لیا کہ مقتول کی قیض کے بٹن کے ساتھ اسی لڑکی کا بال تھا۔ وہ  
اُداس تھی۔ آنکھوں سے پتہ چلتا تھا کہ روتی رہی ہے لیکن اُس نے اپنے  
ہونٹوں کو لب شک سے محروم نہیں رہنے دیا تھا۔ گلاب کے عطر کا  
معمہ کمرے میں داخل ہوتے ہی حل ہو گیا۔ کمرہ گلاب کی تیز خوشبو سے  
مہک رہا تھا۔ میں نے اُس کے ساتھ ہمدردانہ باتیں کیں کہ اس کے  
خاندان کو میں باعزت سمجھتا ہوں۔ مجھے تامل کو پڑنا ہے اور اُسے  
پھانسی کے تختے پر کھڑا کرنا ہے۔ میں نے اُسے صاف الفاظ میں  
یقین دلایا کہ اُس کے خلاف مجھے کسی قسم کا شک نہیں مقتول کی میں  
نے بے حد تعریف کی جس سے لڑکی کے چہرے پر رولتی آگئی۔  
”تم پر یہ ظلم کس نے کیا ہے کہ اس وحشی کچھ کے ساتھ بیاہ دیا  
ہے؟“ میں نے کہا۔ ”میں اُسے دیکھ چکا ہوں۔ وہ میرے تھلے میں

ساتھ غصے میں آکر بہت ہی گستاخی سے بولی تھی۔“

”راجیش اور تمہارا بھائی جس خفیہ جماعت میں تھے اس کے متعلق تمہیں کچھ معلوم ہے؟“

”آپ کو اس کے متعلق کیا معلوم ہے؟ اس نے پوچھا۔“

”میں اس جماعت کا خفیہ ممبر ہوں۔“ میں نے یہ تیر ہوا میں چلایا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ اسے راجیش نے اپنی خفیہ سرگرمیوں سے آگاہ کیا ہوگا۔“

وہ حیران سی ہوتی اور مسکراتی بھی۔ کہنے لگی۔ ”پھر تو آپ اپنے آدمی ہیں۔“ میں نے اُسے بتایا کہ میں اس جماعت کو ڈائنامیٹ اور اسلحہ دے رہا ہوں۔ میرا تیر نشانے پر لگا۔ اُس نے کہا۔ ”راجیش مجھے جاسوسی کی ٹریننگ دے رہا تھا۔ وہ مجھے ایک جگہ لے جایا کرتا تھا۔ وہاں ایک آدمی (ہندو) مجھے بڑے انفرادی سے راز حاصل کرنے کے طریقے بتایا کرتا تھا۔“

اُس نے وہ جگہ بھی بتا دی اور کچھ قیمتی راز بھی دے دیتے۔ یہودیوں کی طرح ہندو بھی جاسوسی اور تخریب کاری کے لئے اپنی حسین لڑکیاں استعمال کرتے رہے ہیں اور اب پہلے سے زیادہ استعمال کرتے ہیں۔ پاکستان ان لڑکیوں سے محفوظ نہیں۔ اس لڑکی نے مجھے راز حاصل کرنے اور نظریاتی تخریب کاری کے چند ایک طریقے بتاتے تھے جو اُسے سکھاتے جا رہے تھے۔ یہ بالکل وہی طریقے تھے جو آپ نے

دروازے کی طرف اشارہ کر کے بتایا۔ وہ اس راستے سے جایا کرتا تھا۔ یہ پھوڑے کو جاتا ہے۔“

”تمہارا بھائی گھر تھا؟“

”میں نے دیکھا نہیں۔“

”راجیش جب یہاں سے نکلا تو تم نے باہر دیکھا تھا؟ میں نے پوچھا۔“ اُسے جاتے ہوئے دیکھا ہوگا۔“

”دیکھا تھا۔“ اُس نے جواب دیا۔

”گلی میں دور یا قریب تمہیں کوئی اور آدمی کھڑا یا اُس کے پیچھے جانا منظر آیا تھا؟“

اُس نے ذہن پر زور دے کر کہا۔ ”گلی کے موڑ تک میں اُسے دروازے میں کھڑی دیکھتی رہی۔ وہ موڑ مڑا تو ایک آدھ منٹ بعد دو آدمی اُدھر جاتے دکھائی دیتے تھے۔ وہاں گلی کی ہتی ہے۔ مجھے اچھی طرح یاد آگیا ہے۔ وہ دو آدمی تھے۔“

”وہ کچھ تھے؟“

”نہیں۔“ اُس نے جواب دیا۔ ”ہندو یا مسلمان تھے۔“

”تمہیں بھائی نے مار پیٹا کیوں تھا؟ میں نے پوچھا۔“ کیا اُسے تمہارے اور راجیش کے تعلقات پسند نہیں تھے؟“

”نہیں۔“ اُس نے جواب دیا۔ ”راجیش کو وہ بہت ہی پسند کرتا تھا۔ اُس نے کبھی اعتراض نہیں کیا۔ مجھے مارا اس لئے تھا کہ میں باپو کے

وں کا توں بڑا تھا۔ کم و بیش بیس روز گزر چکے تھے۔ قاتل کا سراغ نہیں  
سارہا تھا۔ مقتول ہندوؤں اور سکھوں کا لیڈر تھا۔ سرکردہ ہندوؤں نے  
میرے پاس آنا شروع کر دیا۔ وہ مجھ سے پوچھتے تھے کہ کوئی سراغ  
لایا نہیں۔ خطرہ یہ تھا کہ ہندو میرے خلاف کوتاہی یا رشوت خوری کی  
رپورٹ کر سکتے تھے۔ وہ واردات بہت مشہور ہو گئی تھی۔ ہندی کے  
خباہروں نے اسے اہمیت دے کر شائع کیا تھا۔

وہ جہاز آگئے جن کے ساتھ لڑکی کے خاوند نے، اپنے بیان  
کے مطابق، جوتا کھلا تھا۔ میں نے اُن سے الگ الگ اچھی طرح پوچھ  
پچ کی۔ انہوں نے ثابت کر دیا کہ سکھ اُس شام اُن کے پاس چلا گیا تھا  
اور وہ ساری رات جوتا کھلتے رہے تھے۔ سکھ مجھ سے اس لئے چُپا  
رہا تھا کہ جوتا بازی جرم تھا۔ وہ جو تے کے اڈے کی نشاندہی کرنے سے  
بہرہ رہا تھا۔ میں نے اُس پر قتل کا الزام عائد کیا تو اُس نے اصل بات  
نادی۔ جو تلے کا یہ اڈہ میرے لئے نیا تھا۔ یہ جہاز بھی نئے تھے۔ یہ پیر  
بزم آباد مسکس نہیں تھے۔ یہ سب روپے پیسے والے زمیندار تھے۔ اڈہ  
پلانے والے البتہ پیشہ ور تھے۔ سکھ کو تفتیش سے خارج کر کے میرے  
ل کو بہت تکلیف ہوتی۔ میرے ہاتھ میں اب کچھ بھی نہیں رہ گیا تھا۔  
یہ قتل بلا شک شبہ انتقامی قتل تھا۔ اگر یہ رہزی کی واردات  
ہوتی تو مقتول کی گھڑی، انگوٹھی اور جیب سے نقدی غائب ہوتی۔ رہزموں  
قتل کی ضرورت صرف اس لئے پیش آتی کہ مقتول نے مزاحمت کی ہوتی

سلطان صلاح الدین ایبھی کی کہانیوں۔ داستان ایمان فردشتوں کی۔  
میں صلیبی لڑکیوں کے متعلق پڑھے ہوں گے۔  
میں اسے یہ یقین دلا کر کہ میں اس کی جماعت کا ممبر ہوں ا  
یہ تاکید کر کے کہ اپنے کسی بھی آدمی سے میرا ذکر نہ کرے وہاں۔  
تھانے چلا گیا۔

## ایک خط ایک جذبہ

تھانے جاکر عثمان کو بتایا کہ میں نے کیا راز حاصل کیا ہے۔ اُس  
نے اور میں نے سی۔ آئی۔ ڈی کے WAR STAFF کے لئے ایک  
رپورٹ تیار کی۔ ”وار سٹاف“ سی۔ آئی۔ ڈی کا شعبہ تھا جو جنگ کے دوران  
جاسوسوں کو پکڑنے کے لئے بنایا گیا تھا۔ اس کا رابطہ ملٹری انٹیلی جنس  
کے ساتھ تھا۔ مقتول، سکھ تاجر، اس کے بیٹے اور بیٹی اور ان کی خُنیہ  
پارٹی کی سرگرمیاں صرف انگریزوں کے خلاف ہوتی تھیں تو میں ان کے  
خلاف رپورٹ نہ کرتا، وہ تو مسلمانوں کے خلاف اور منظرِ پاکستان کے  
خلاف بھی بڑی خطرناک کارروائیاں کر رہے تھے۔ میں نے یہ رپورٹ اپنے  
ضلع کے ہیڈ کوارٹر کو اُسی روز دستی بھیج دی۔ وہاں سے اسے وار سٹاف  
کو جانا تھا۔

لڑکی کے خاوند کو تھانے میں بٹھائے رکھا۔ میرا اصل مسئلہ تو ابھی



مگر اس کے کپڑوں اور جسم پر مزاحمت کے کوئی آثار نہیں تھے۔ اس کے علاوہ بہن خنجر یا چاقو استعمال کیا کرتے تھے۔ قتل کا باعث بہرہ سکھ لڑکی تھی۔ لڑکی کی ملاقات کے فوراً بعد اس کا قتل ہو جانا بتاتا تھا۔ قاتل لڑکی کا بھائی، باپ یا خاوند ہے یا کوئی ایسا آدمی جو مقتول کا رقیہ تھا۔ مقتول کی میتض کے ساتھ لڑکی کا ایک بال اور لب شک ایک کہا بیان کر رہی تھی۔ مجھے بھائی، باپ اور خاوند کو ہی مشتبہ رکھنا تھا۔

میں عثمان کے ساتھ اس مسئلے پر بحث کر رہا تھا۔ عثمان اپنی عا کے مطابق مجھے کہہ رہا تھا کہ میں اُسے اس لڑکی سے پوچھ گچھ کی اجازت دے دوں۔ میں اُسے اجازت نہیں دے رہا تھا۔ میں اُسے اچھی طرح جانتا تھا۔ وہ دوسرا مشورہ یہ دے رہا تھا کہ تمام مشتبہ آدمیوں کو تھانہ لگا کر دوسرا طریقہ اختیار کروں۔ میں تشدد کا قائل نہیں تھا۔ اس دور لڑکی کا بھائی میرے پاس آتا رہا اور وہ مجھے اپنی خفیہ جماعت کا مجب سمجھتا رہا۔

ڈاک اگتی چند ایک خطوط تھے جو عثمان نے ہی کھولے۔ ایک پڑھ کر اس نے میرے آگے رکھا اور کہا۔ ”اس پر آپ یقین کریں گے میں نے خط پڑھا۔ اردو میں لکھا تھا۔ نیچے کوئی نام نہیں تھا۔ اوپر کوئی مقام نہیں تھا۔ لفافے کے ٹکٹ پر جو مہر تھی وہ اتفاق سے صاف نہیں بھٹی۔ خط کے سارے الفاظ آج مجھے یاد نہیں رہے۔ جو کچھ لکھا تھا وہ یاد ہے۔ لکھا تھا:

۴۴

”جناب عالی! السلام علیکم۔ ہمیں خوشی ہے کہ آپ مسلمان ہیں۔ اسی لئے ہم آپ کو یہ خط لکھ رہے ہیں تاکہ آپ تفتیش کی پریستانی سے محفوظ رہیں۔ بیٹھ راجیش کو ہم نے قتل کیا ہے۔ یہاں کے ہندو اور سکھ نوجوان لڑکوں نے ایک خفیہ پارٹی بنا رکھی ہے جو کانگریس کی ہائی کمان اور انڈین نیشنل رمی کے نمائندوں کے احکامات پر عمل کرتی ہے۔ یہ لوگ ہندوستان میں ہندوؤں کی حکومت قائم کرنے کے لئے بڑے خطرناک منصوبے مار رہے ہیں۔ ایک منصوبہ یہ ہے کہ جاپان کی فوج آجائے گی تو مسلمانوں کو قتل عام کیا جائے گا، اور اس سے وہی مسلمان بچ سکے گا جو ہندو بہن میں آجائے گا۔۔۔۔

”راجیش اس پارٹی کا لیڈر تھا۔ ہمیں ہندو لڑکوں نے وہ چھکیاں دینی شروع کر دی تھیں۔ اس کے جواب میں ہم نے بھی ایک خفیہ پارٹی الی ہے۔ ہمارے منصوبے بھی ہندوؤں کی طرح خطرناک ہیں۔ مسلم لیگ نے پاکستان کو اپنا مقصد بنایا ہے جس میں چند ایک صوبے شامل لئے گئے ہیں لیکن ہم سارے ہندوستان کو پاکستان بنائیں گے ہندوستان میں ہندو حکومت نہیں بننے دیں گے۔ ہم نے اپنے منصوبے پر عمل شروع دیا ہے۔ بسم اللہ سیٹھ راجیش سے کی ہے۔ مہاتما گاندھی اور پنڈت روکی بھی باری آجائے گی۔ ہم اپنے گروہ کو سارے ملک میں پھیلانے کو شش کر رہے ہیں تاکہ ہندوؤں اور سکھوں کے خلاف جلد ہی سہاؤ نہ ہو جائے۔ ہندوستان اسلامی ملک بنے گا۔“

## قاتل آگئے

میں نے پہلے بھی راستے دی ہے کہ نوجوان جذباتی ہوتے ہیں، عقل کی بجائے جذبات سے کام لیتے ہیں۔ یہ خط دیکھ کر مجھے جہاں بے حد خوشی ہوئی وہاں افسوس بھی ہوا۔ خوشی اس کی تھی کہ ہندوستان میں مسلمان نوجوان بیدار تھے اور اپنے ورثے کو پہچانتے تھے۔ افسوس اس پر ہوا کہ ان کا کوئی لیڈر نہیں تھا جو انہیں خفیہ سرگرمیوں کی ٹریننگ دیتا اور ان کے جذبے کو عقل سے استعمال کرتا۔ اگر مسلمان ہندوؤں کی طرح زمیں دوز تسلیم چلا تے تو ہندوستان کی تاریخ مختلف ہوتی۔ ان دونوں نوجوانوں کو مجھے خط نہیں لکھنا چاہیے تھا۔ انہوں نے اپنا کام کر لیا تھا۔ خاموش رہتے۔ یہ ان کی خوش قسمت تھی کہ انہوں نے مجھے خط لکھا تھا۔ کوئی اور ہوتا تو اسے تفتیش میں شامل کر کے ان کی تلاش شروع کر دیتا۔

میں نے عثمان سے مشورہ کر کے خط اپنی جیب میں ڈال لیا۔ یہ ہمارا فیصلہ تھا کہ اسے تفتیش کے ریکارڈ میں نہیں رکھا جائے گا لیکن خط لکھنے والوں سے ملنا ضروری سمجھا۔ ایک تو میں یہ یقین کرنا چاہتا تھا کہ سیٹھ راجیش کے قاتل وہی ہیں اور دوسرا ارادہ یہ تھا کہ انہیں یہ نصیحت کرنی تھی کہ جذباتیت سے بچیں۔ میرے لئے قتل کا یہ کیس پیچیدہ بنتا جا

اس خط میں انہوں نے سیٹھ راجیش کے قتل کا یہ طریقہ لکھا کہ اس مسلمان گروہ کے دو نوجوان مقتول کا پیچھا کر رہے تھے۔ انہوں نے کہ وہ اکثر کچھ تاجر کے گھر جاتا ہے۔ مندر کی میٹنگ کے بعد اس گروہ کسی ممبر نے اُسے کچھ تاجر کے گھر کو جاتے دیکھ لیا اور جو نوجوان قتل لئے مقرر ہوتے تھے انہیں اطلاع دی۔ وہ گلی میں اس کا انتظار کر رہے۔ ان کے پاس گزرجہاں رستی تھی مقتول کچھ لڑکی کے کمرے۔ نکلا تو دونوں قاتل جو گلی کی ٹوکڑ پر کھڑے تھے اس کے پیچھے چل پڑے۔ وہ اندھیری گلی میں پہنچا تو ایک نے اُسے پیچھے سے دبوچ لیا۔ دوسرے نے تیزی سے اس کی گردن کے گرد رستی ڈالی اور رستی کو مرد ٹکر بھینا تنگ کیا پھر چٹکے دیتے۔ وہ مر گیا تو دونوں چلے گئے۔

یہ خط لوگس ہو سکتا تھا۔ اصل قاتل نے مجھے گمراہ کرنے کے۔ یہ طریقہ اختیار کیا ہو گا لیکن میرے پاس تصدیق پہلے آچکی تھی۔ اس کچھ لڑکی سے پوچھا تھا کہ جب راجیش اس کے کمرے سے نکلا تو اس نے اُسے گلی میں جاتے دیکھا تھا؟ اور کیا اُس نے کسی اور کو بھی گلی میں دیکھا تھا؟ لڑکی نے بتایا تھا کہ جب راجیش گلی کا موڑ مڑا تو اس نے دو آدمی اُس کے پیچھے جاتے دیکھے تھے۔ وہ کچھ نہیں مسلمان، ہندو تھے۔ وہ یہی دو نوجوان ہو سکتے تھے۔

میں ابھی کچھ لڑکی کے بیان پر یقین کرنے کے لیے بھی بیٹا نہیں تھا۔ بہر حال مجھے یہ دیکھنا تھا کہ یہ خط واقعی مسلمان لڑکی نے لکھا ہے۔

کہ ان تین مسلمان لڑکوں کو اس طرح تھانے لے آتے کہ کبھی کو پتہ نہ چلے اور انہیں شک بھی نہ ہو۔ میں نے یہ بھی کہا کہ انہیں تھانے کی بجائے دوسرے راستے سے میرے گھر لے آتے۔

عثمان ڈھین اے۔ ایس۔ آتی تھا۔ رات کو تینوں کو لے آیا۔ میں انہیں گھر پر لا۔ انہیں تسلی دی کہ وہ ڈر رہیں۔ تینوں میرے سامنے چار پاتی پر بیٹھ گئے۔ ان کے ہاتھ مجھے نظر آرہے تھے۔ ایک کے ہاتھ کی اٹنی طرف دو لمبی خراشیں صاف دکھائی دے رہی تھیں۔ زخم ٹھیک ہو چکے تھے۔ نشان باقی تھے۔ میں نے جیب سے خط نکال کر اسے دکھایا اور کہا۔ ”یہ خط تم نے لکھا ہے یا تمہارے ساتھی نے جو راجیش کے قتل میں تمہارے ساتھ تھا؟“

اُس کا رنگ لاش کی طرح سفید ہو گیا۔ آنکھیں پھٹ گئیں۔ اس کے ہاتھ پر خراشیں مقول کے ناخنوں کی تھیں۔ میں نے اُسے حوصلہ دیا اور کہا۔ ”ڈرو مت۔ صاف بتا دو۔ اگر میں تمہیں گرفتار کرنا چاہتا تو اپنے گھر نہ بلاتا۔ بولو، ورنہ میں تمہارے سچاؤ کے لئے کچھ نہیں کر سکوں گا۔“

”یہ خط میں نے لکھا ہے۔“ اُس کا ایک ساتھی بول پڑا۔  
”قتل کس نے کیا تھا؟“

”میں نے۔“ اسی نوجوان نے کہا۔

”اور تم نے اسے پیچھے سے دبوچا تھا؟“ میں نے خراشوں والے

رہا تھا۔ مجھے اب ”دارشان“ کا انتظار تھا۔ میں یہ خواب دیکھ رہا تھا کہ سی۔ آئی۔ ڈی اور ملٹری پولیس آئے گی اور جہاں جہاں میں نے نشانہ کی ہے وہاں چھاپے مارے گی۔ اسلحہ بردار ہو گا۔ کچھ ہندو بیکھ پکڑے جائیں گے۔ اس سے لڑکوں کی توجہ اُدھر ہو جائے گی اور میں قتل کرکس کسی طرح گول کر سکتوں گا۔

میں نے اُسی روز کچھ لڑکی کے بھاتی اور اُس کے دو ہندو دوستوں کو بلایا۔ اُن کے ساتھ خفیہ کاموں کی باتیں کیں۔ انہیں کچھ نصیحتیں کیں اور بتایا کہ میں انہیں جلد ہی کچھ اسلحہ اور ڈائنامیٹ دے رہا ہوں۔ ان سے کہا کہ مجھے معلوم ہوا ہے کہ انہوں نے یہاں کے بعض مسلمان لڑکوں کو دھمکیاں دی تھیں۔ وہ کون تھے؟ انہوں نے مجھے تین لڑکوں کے نام بتاتے تھے جو اس قصبے کے رہنے والے تھے۔ میں نے انہیں نصیحت کی کہ وہ کسی کو دھمکی نہ دیں کیونکہ اس طرح پکڑے جانے کا خطرہ ہے۔

”وہ اپنے آپ کو منغلہ خاندان کا جانشین سمجھتے ہیں۔ ایک ہندو نوجوان نے کہا۔“ وہ کہتے ہیں کہ ہندوستان مسلمانوں کی جاگیر ہے۔ میں نے ان پر یہ ظاہر کیا کہ میں نے انہیں تھانیدار کی حیثیت سے نہیں ان کی جماعت کے ممبر کی حیثیت سے بلایا ہے۔ یہ نادان لڑکے میرے جال میں آگئے تھے۔ میری آستادی کے سامنے ان کی وقعت ہی کیا تھی.... انہیں رخصت کر کے میں نے عثمان سے کہا

## سی، آتی، ڈمی کا چھاپہ۔ لڑکی خطرناک تھی

”وارسٹاف“ کو رپورٹ بھیجی ایک ہفتہ گزر گیا تھا۔ میں پریشان ہونے لگا تھا کہ سی آتی، ڈمی نے کوئی کارروائی نہ کی تو کیا ہو گا۔ رات کو اچانک وہ لوگ آگئے۔ اس پارٹی میں ایک ہندو اسے۔ ایس۔ آتی تھا۔ ملٹری انٹیلی جنس کا ایک انگریز فٹنٹ تھا اور دیگر سٹاف بھی تھا جس کا اسچارج بہار کا رہنے والا ان پکڑٹھارہ علی خان تھا۔ اس کے ساتھ میری اچھی راہ ور سم تھی۔ یہ پارٹی رات دس گیارہ بجے کے درمیان پہنچی اور اسی وقت چھاپے مارنے کے لئے تیار ہو گئی۔ میں نے اپنے کانسٹیبل تیار کر لئے۔ تین بجوں پر بیک وقت چھاپہ مارا تھا۔ رات بارہ بجے کے قریب کچھ تاجر کے گھر، مقتول کے گھر اور ایک ہندو جوہر سکھ کے بیٹے کا دوست تھا اس کے گھر چھاپہ مارا گیا۔ تینوں چھاپے پوری طرح کامیاب تھے۔ مجھے اب یاد نہیں رہا کہ کس کے گھر سے کیا برآمد ہوا تھا مجموعی طور پر ہر گھر سے دو دو تین تین ریوا لور، ان کی گولیاں، برہمیوں اور خجروں کی بہت بڑی تعداد، ڈمی ساخت کے دستی بم اور مزید بم بنانے کے لئے سامان برآمد ہوا۔ کچھ تاجر اور مقتول کے گھر سے کچھ خطوط بھی ملے تھے جو میں نے نہیں دیکھے بہر حال ٹھوس ثبوت مل گئے۔

سے پوچھا۔  
اُس نے خوفزدگی کے عالم میں سر ہلا کر آہستہ سے کہا۔ ”ہاں۔“  
”اُس نے تمہارے ہاتھ پر ناخن مارے تھے؟“ میں نے پوچھا اور اسے تسلی دینے کے لئے کہا۔ ”میں کہہ رہا ہوں ڈرو مت۔“  
”جی ہاں؟“ اُس نے جواب دیا۔ ”میں نے اُسے پیچھے سے بازوؤں میں جکڑ لیا تھا۔ اُس کا ایک ہاتھ شاید آزاد رہ گیا تھا۔ اُس نے ناخنوں سے چھیل دیا۔“

میں نے عثمان سے ماچس لے کر خط اُن کے سامنے جلا ڈالا اور انہیں لمبا چوڑا لکچر دیا جس کا کب لباب یہ تھا کہ کسی بڑی عمر کے آدمی کو اپنا لیڈر بنائیں اور محض جذبات میں آکر کوئی کارروائی نہ کریں، اور اگر قتل جیسا سنگین جرم کر بیٹھیں تو اسے ہضم کرنے کی کوشش کریں۔ زبان سے ہندوؤں پر دھاک بٹھانے کی حماقت نہ کریں، بلکہ ان کے آگے جھکے رہیں۔ شو بازی سے گریز کریں۔ میں نے ایسی بہت سی باتیں کہہ سن کر انہیں رخصت کیا۔ مجھے روحانی سکون محسوس ہوا۔ میں بہت دیر تک عثمان کے ساتھ قدم کی آزادی اور ہندوستان کے مستقبل کے متعلق باتیں کرتا رہا۔

”اس کانر کے قتل کا کیا بنے گا؟“ عثمان نے پوچھا اور میری سوچوں کا رخ بدل گیا۔

تھامے میں جنہیں گرفتار کر کے لایا گیا ان میں کچھ تاجر اس کا بیٹا، اس کی بیٹی اور تین ہندو شامل تھے۔ مردوں کو میری حوالات میں بند کر دیا گیا۔ انگریز لیفٹیننٹ کو ڈاک جنگلے میں قیام کرنا تھا۔ کچھ لڑکی کو وہ اسے ساتھ لے گیا۔ مجھے یہ ڈر محسوس ہونے لگا کہ یہ گورنر لڑکی کے چکر میں آکر کہیں برباد کر دے گا۔ دوسرے دن میرا ڈر دور ہو گیا۔ اس نے لڑکی کو میری حراست میں دے کر کہا ”بہت خطرناک گروہ ہے۔ اگر آپ اس لڑکی کی نشاندہی نہ کرتے تو یہ بہت بڑے نقصان کا باعث بن سکتی تھی۔“ لڑکی کی حالت بتا رہی تھی کہ یہ رات بھر جاگتی رہی ہے۔ انسپکٹر حامد علی خان میرے گھر میں ٹھہرا تھا۔ اُس نے ہندوؤں کے عزائم کے متعلق تاہیں شروع کر دیں اور اس قسم کی راستے دی کہ یہ لوگ اگر انگریزوں کے خلاف کچھ کریں تو کوئی بات نہیں۔ یہ مسلمانوں کا قلع قمع کرنے کی کارروائیاں کر رہے ہیں۔ میں انہیں نکلنے نہیں دوں گا.... اُس کے یہ جذبات دیکھ کر میں نے سیٹھ راجیش کے قتل کی اصل حقیقت اُسے بتا دی۔ میں نے صاف بتا دیا کہ اسے مسلمان نوجوانوں نے قومی جذبے کے تحت قتل کیا ہے۔ میں نے اسے مدد کے لئے کہا۔ اس نے پہلی بات یہ کہی کہ ملک صاحب، ان لڑکوں کو گرفتار نہ کر لینا۔ میں نے اُس سے مشورہ لیا اور بہت دیر لاسی مسئلہ پر بات چیت کرتے رہے۔

میں نے انسپکٹر حامد علی خان سے کہا کہ وہ ایسے شعبے میں

ہے جس کا ہر طرف رعب اور اثر و رسوخ ہے۔ وہ کوشش کر کے قتل کا کیس سپیشل سٹاف کے حوالے کرادے اور ایسا تاثر پیدا کرے کہ مقتول کو اس کی خفیہ جماعت کے کسی آدمی نے اختلافاً کی بنا پر قتل کیا ہے۔

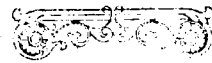
ڈیڑھ دو ہفتے بعد یہ معجزہ ہوا کہ قتل کا کیس ہیڈ کوارٹر کے سپیشل سٹاف نے لے لیا اور مجھے ایک سپیشل ڈیوٹی پر دلی بھیج دیا گیا۔ پیچھے عثمان رہ گیا تھا۔ دو ماہ بعد وہ بھی مجھ سے آ ملا۔ اور ہم دونوں ایک اور تھانے میں اکٹھے رہے جہاں عثمان مارا گیا تھا۔

۱۹۴۶ء میں ہندوؤں نے اپنے عزائم کی تکمیل کے لئے بہار میں مسلمانوں کا قتل عام کیا، ان کے گھروں کو آگ لگائی اور مستورات کو ذلیل و خوار کیا۔ بڑا ہی ظالمانہ قتل عام تھا۔ اُس وقت تک جنگ ختم ہو چکی تھی۔ جاپان ہتھیار ڈال کر تباہ ہو چکا تھا۔ ہندوؤں کے ہندو راج کے خواب چکنا چور ہو گئے تھے۔ مسلمان بیدار ہو کر جنگ آزادی کا آغاز کر چکے تھے۔ ہندوؤں نے مسلمانوں کو ختم کرنے کے لئے قتل عام کا طریقہ اختیار کیا۔ پہلے گڑھ مکیش میں پھر بہار میں مسلمانوں پر لوٹ پڑے۔

اگست ۱۹۴۷ء کے پہلے ہفتے میں میں دلی میں تھا۔ ایک انسپکٹر نے بتایا کہ انسپکٹر حامد علی خان جو بہار کا رہنے والا تھا، اپنے شہر میں ہندوؤں کے حملے کی خبر سن کر رلیو اور لے کر بغیر اجازت چلا گیا۔ وہاں کی تباہی

دیکھ کر وہ پاگل ہو گیا۔ اُسے جو ہندو نظر آیا اُس نے اُسے رلیو البور کا  
نشانہ بنایا۔ آخر ہندوؤں نے اُسے گھیر کر شہید کر دیا۔  
سیٹھ راجیش کے قتل کا بچہ کچھ بڑا نہیں تھا، مگر یہ پتہ چلا کہ  
جو لوگ تحریبی کارروائیوں میں لگے تھے، اُن کا کیا بننا۔

## محبت کے پھندے سے لوہے کے پھندے تک



جوان آدمی خوب رو، خوشحال مسلمان زمیندار کا بیٹا، عمر ابھی تیس  
سال نہیں ہوئی تھی، جنگل میں مرا پڑا تھا۔ وہ شکار کھیلنے گیا تھا۔ اُس کی  
بارہ بور کی بندوق اُس کے پاس پڑی تھی۔ اگر محکمہ جنگلات کے دو آدمی  
اُسے دیکھ نہ لیتے تو پولیس تک اطلاع ہی نہ پہنچتی اور درندے پولیس  
کو ایک قتل کی تفتیش سے بچا لیتے۔ اگلی صبح تک لاش کی بڑی بھی نہ  
ملتی۔ ہندوستان کے اس علاقے میں ہرن کی نسل کے جانور اور حقوڑی  
سی تعداد میں گاتے کی بھی تھی۔ شیر بھی تھے لیکن بہت ہی حقوڑی تعداد  
میں۔ بھیڑیتے زیادہ تھے۔ وہاں پرندوں کے شکار کے لئے لائنس  
لینا پڑتا تھا۔ بڑے شکار کی ممانعت تھی۔ محکمہ جنگلات کے ہیڈ کوارٹر  
سے جو وہاں سے بہت دور تھا ایک ہرن یا ایک نیل گاتے مارنے کی  
تحریری اجازت مل جاتی تھی لیکن یہ اجازت نامہ کسی رسوخ والے کو یا  
کسی انگریز کو ہی ملتا تھا۔

سونے کی انگوٹھی تھی۔ ان قیمتی اشیاء کی موجودگی بتاتی تھی کہ یہ واردات رہزنی کی نہیں، ورنہ یہ اشیاء لاش کے ساتھ نہ ہوتیں۔ یہ واردات کسی پیشہ ور مجرم کی ہوتی تو بندوق اور کارٹوس غائب ہوتے۔

پھر ایک گھوڑی برآمد ہوتی جو جاتے واردات سے سو ڈیڑھ سو گز دور ایک درخت کے ساتھ بندھی ہوتی تھی۔ مقتول کا گاتوں جلتے واردات سے تین میل دور تھا۔ گھوڑی مقتول کی ہو سکتی تھی۔ وہاں اس کا کوئی مالک نہیں تھا۔ قاتل کی ہوتی تو یہاں بندھی نہ رہ جاتی۔ میں نے اپنے ساتھ لاتے ہوئے کانشیل کو یہی گھوڑی دے کر کہا کہ کھوجی کو بلا لاتے اور مقتول کے گاتوں اس کے گھر اطلاع دیتا جاتے ہیں۔ اس دوران کھرے دیکھنے کی کوشش کر دی۔ زمین کھڑوں کے لئے اچھی تھی۔ لاش کے ارد گرد جنگلات کے ان دو اہلکاروں کے کھرے اتنے تھے کہ وہاں مقتول اور قاتل کے کھرے ڈھونڈنا مشکل تھا۔ میں کھرے اٹھانے کے فن سے باقاعدہ واقف بھی نہیں تھا۔ لاش سے چھ سات قدم دور ایک کھرہ نظر آیا جو لاش کی جگہ سے جا رہا تھا۔

یہ چونکہ عام گزرگاہ نہیں تھی اس لئے وہاں ان دونوں اہلکاروں کے سوا اور کسی کے پاؤں کے نشان نہیں تھے۔ میں نے کھرے دیکھنے چھوڑ دیئے کیونکہ یہ کھوجی کا کام تھا اور کوئی کھرہ میرے پاؤں سے گم ہونے کا خطرہ تھا۔ میں محکمہ جنگلات کے ان دونوں آدمیوں سے باتیں کرنے لگا۔ گو ایسا ممکن تو نہیں تھا لیکن ان پر بھی شک کیا جاسکتا تھا۔

اس جنگل کے ایک اہل کار نے بتانے میں اطلاع دی کہ وہاں ایک جوان آدمی کی لاش پڑی ہے۔ اُس وقت تک لاش کا پیٹ تین چار گدہ پھاڑ چکے تھے۔ مجھے کا ایک آدمی لاش کی حفاظت کے لئے وہاں موجود رہا۔ میں جاتے واردات پر فوراً پہنچا۔ میرا خیال تھا کہ لاش خون آلود ہوگی اور اسے کسی درندے نے مارا ہوگا، یا اسے اپنے کسی شکاری ساتھی کی گولی لگ گئی ہوگی اور وہ ساتھی بھاگ گیا ہوگا، مگر لاش پر خون کا ایک قطرہ بھی نہیں تھا۔ گدھوں نے پیٹ پھاڑ کر انٹریاں باہر نکال دی تھیں۔ وہاں بھی خون نہیں تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ اس کے مرنے کے بعد گدھ آتے تھے۔ میں نے جسم کا نظری معائنہ کیا۔ کہیں کوئی زخم یا چوڑ نہیں تھی۔ گردن پر نظر پڑی تو موت کا باعث معلوم ہو گیا جسے پولیس والے فوراً پہچان لیا کرتے ہیں۔ اسے ہاتھوں سے گھلایا کر مارا گیا تھا۔ جسے ہوتے خون کے نشان صاف تھے۔

میرے ساتھ ہیڈ کانشیل تھا۔ وہ مجھ سے چار سال پہلے کا اس نٹھانے میں تھا۔ اُس نے مقتول کو فوراً پہچان لیا۔ اُس کے باپ کا نام بھی بتا دیا اور گاتوں کا بھی۔ وہ خوشحال زمیندار تھا۔ مقتول کی بندوق لاش کے قریب پڑی تھی۔ مارے ہوئے چار پانچ پرندے ادھر ادھر پڑے تھے۔ مقتول کے کُرتے کی جیب سے ایک نوٹ دس روپے کا، ایک پانچ روپے کا اور دو تین روپے کے کتے برآمد ہوئے۔ اُس کے گلے میں ایک تنوید تھا جو سونے کے چوکور خول میں مڑھا ہوا تھا اور انگلی میں



انہوں نے بتایا کہ یہاں ہرن وغیرہ کے شکار کی اجازت نہیں۔ بعض آدمی پچھندہ (چھابی) لگا کر ہرن پکڑتے ہیں اور ان کی کھالیں اور گوشے نکالتے ہیں۔ لگے ہوئے پچھندوں کی تلاش میں محکمہ جنگلات کے آدمی جنگل میں پھرتے رہتے تھے۔

اُس روز یہ لاش دیکھنے سے پہلے انہوں نے ایک پچھندہ پکڑا تھا جو قریب ہی ایک درخت کے ساتھ پڑا تھا۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ پچھندے میں کوئی جانور پھنسا تھا لیکن نکل گیا ہے۔ پچھندے کے دندانوں پر خوں لگا ہوا ہے۔ مجھے اس پچھندے کے ساتھ اور اس میں سے نکل جانے والے جانور کے ساتھ کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ میرے سامنے ایک خوب رو جوان کی لاش پڑی تھی جس کی تفتیش مجھے نہ جانے کون سے چکر میں ڈالنے والی تھی۔ کھوجی کے انتظار میں مجھے وقت گزارنا تھا۔ اس لئے میں نے پچھندے کو دیکھنا شروع کر دیا۔

یہ لوبہ کا پچھندہ تھا۔ نوکدار دندانوں والے دو حصے تھے۔ دونوں نئے چاند کی شکل کے تھے۔ دونوں کے دندانے آپس میں ملے ہوئے تھے۔ انہیں کھول کر ایک ٹک کی مدد سے پچھندے کے باقی حصے کے ساتھ لگا دیا جاتا تھا پچھندے کے ساتھ دو اڑھائی فٹ لمبی زنجیر تھی جس کے ایک سرے پر مضبوط کڑا تھا۔ یہ لکڑی کے ایک ٹکے اور موٹے کیل میں ڈال کر کیل پودہ زمین میں گاڑ دیا جاتا تھا پچھندہ بھی زمین کے ساتھ مٹی اور گھاس میں چھپا ہوتا تھا۔ جانور کا پاؤں اس

پر پڑتا تو دندانے تراخ سے بند ہو کر جانور کا ٹخنہ جکڑ لیتے تھے۔ دندانے کھال میں اتر جاتے اور جانور نکل نہیں سکتا تھا۔ پچھندہ لگانے والا اگر جانور کو رستی سے باندھتا اور پچھندہ کھول لیتا تھا۔

میں نے اس پچھندے کے دندانوں پر خون دیکھا تو میں سوچنے لگا کہ اس میں سے جانور نکل کس طرح گیا۔ یہ ہو سکتا تھا کہ صرف کھال پچھندے میں آتی اور جانور نکل گیا لیکن کھال کا ذرا سا ٹکڑا یا بال کسی نہ کسی دندانے میں ہونے چاہئیں تھے جنگلات کے یہ اہل کار خوش تھے کہ انہوں نے ایک پچھندہ پکڑ لیا ہے۔ پچھندہ لگانے والے کو پکڑنا ممکن نہیں تھا۔ یہ دونوں اہل کار میرے ساتھ رہے۔ انہیں میرے ساتھ ہی رہنا تھا۔ دونوں گواہ تھے اور میری نظر میں یہ ابھی مشتبہ بھی تھے۔ میں ان کے ساتھ گپ شب گپ کرتا رہا اور یہ بیان کرنے کی بھی کوشش کرتا رہا کہ قتل کے ساتھ ان کا کوئی تعلق ہے یا نہیں۔ یہ ممکن تھا کہ پچھندہ مقتول نے لگایا ہو اور ان دونوں نے اسے پکڑ لیا ہو اور جھگڑے نے ایسی صورت اختیار کر لی ہو کہ انہوں نے اسے گلا دبا کر مار ڈالا ہو۔ ان کے کھرے اس کھرے سے مختلف تھے جو میں نے جاتے واردات سے جانا دیکھا تھا۔

## خون آلود کپڑے کے ٹکڑے

مقتول کا باپ، ماں اور بہت سے آدمی کھوجی اور کانسٹیبل

مقتول کے باپ نے بتایا کہ ہندو راجپوتوں کے ایک خاندان کے ساتھ دشمنی ہے۔ دس سال گزرے اگھیتوں کو پانی لگانے کی باری پر جھگڑا ہو گیا جو لڑائی تک پہنچ گیا تھا ہندو راجپوت بھی طاقت اور پیسے والے زمیندار تھے۔ اس لڑائی میں اُن کا ایک آدمی مارا گیا، چند ایک زخمی ہوئے تھے اور اس مسلمان زمیندار کے تین چار آدمی صرف زخمی ہوئے تھے۔ دو آدمیوں کو عمر قید ہوئی لیکن اپیل میں وہ بری ہو گئے تھے۔ میرے پوچھنے پر مقتول کے باپ نے بتایا کہ اس کے بعد ہندو راجپوتوں نے چیٹر چھاڑ نہیں کی اور ان کے ساتھ کوئی جھگڑا نہیں ہوا۔ باپ سے میں نے اُس کے بیٹے کے چال چلن کے متعلق پوچھنا بیکار سمجھا۔ کوئی باپ اپنے بد معاش بیٹے کو بد معاش نہیں کہتا۔ یہ معلومات مجھے دوسرے ذرائع سے حاصل کرنی تھیں۔

میں بہت دیر اُس سے پوچھ گچھ کرتا رہا۔ وہ ابھی سوچ کر جواب دینے کے قابل نہیں تھا۔ بات کرتے کرتے چپ ہو جاتا اور اُس کی دھڑلیں نکل جاتیں۔ کھوجی میرے پاس آیا اور سر کے اشارے سے مجھے ساتھ چلنے کو کہا۔ یہ اشارہ بتاتا تھا کہ اُس نے زمین سے کوئی بھید لے لیا ہے۔ وہ مجھے ایک طرف لے گیا۔ ایک کھڑا ایک طرف سے لاش کی طرف آ رہا تھا۔ یہی کھڑا دوسری طرف لاش سے ہٹ کر جا رہا تھا۔ یہ کھڑا مقتول کا نہیں تھا۔ کھوجی مقتول کی جوتی دیکھ چکا تھا۔ کھڑا کسی ایسے آدمی کا بھی ہو سکتا تھا جس نے فرار اور سے گزرتے لاش پڑی دیکھی۔

سے پہلے پہنچ گئے۔ کانشیل انہیں اطلاع دے کر کھوجی کو بلائے جا گیا تھا۔ میں نے انہیں وہاں سے دُور رکھا جہاں میں نے کھڑے ہوئے تھے قیامت کا سماں بندھ گیا۔ مقتول کی ماں اور اُس کا باپ اس صدمے سے پاگل ہوئے جا رہے تھے۔ کانشیل کے کہنے پر وہ چار پانی لے آئے تھے۔ لاش اٹھو کر چار پانی پر رکھوا لی۔ ایسی دلہ روزیغیں اور دھڑلیں مجھ سے برداشت نہیں ہو رہی تھیں۔ پھر کھوجی بھی آگیا۔ مقتول کے باپ نے لاش کی شناخت کے ساتھ گھوڑی بھی پہچان لی۔ مقتول صبح سویرے گھوڑی پر سوار کو نکلا تھا۔ اُس کے پاس پرندوں کے شکار کا لائنس تھا میں نے ہیڈ کانشیل سے کہا کہ وہ لاش لے جاتے اور پوسٹمارٹم کا انتظام کراتے۔ کھوجی نے میرے کہنے پر اپنا کام شروع کر دیا اور میں نے مقتول کے باپ کو الگ کر لیا۔ مجھے سب سے پہلے قتل کا باعث معلوم کرنا تھا۔ میرا خیال تھا کہ یہ خاندانی دشمنی کا نتیجہ ہے۔ دیہات میں ایسے قتل ہوتے ہی رہتے تھے۔ دوسری وجہ یہ ہو سکتی تھی کہ بڑے زمینداروں کے بیٹے کسانوں اور مزارعوں کی بہو بیٹیوں کے پیچھے پڑے رہتے تھے۔ کسی غیرت مند نے اس شہزادے کو غیرت کے جوش سے قتل کر دیا ہوگا۔ خاندانی عداوت اور غیرت کے جوش سے جو قتل ہوتے ہیں ان میں ٹوٹا نہیں جاتا کیونکہ مقصد لوٹنا نہیں ملتا۔ انتقام لینا ہوتا ہے۔ اس واردات میں مقتول کی نقدی سونے کی انگوٹھ سونے کے کنوینڈا بندوق اور کارٹوں لاش کے ساتھ تھے۔

یعنی کپڑے کے خون آلود ٹکڑوں تک اس طرح کیا کہ بائیں پاؤں  
ٹھیک پڑ رہا ہے اور دائیں پاؤں کا کہیں صرف پنجہ ہے اور کہیں صرف ایڑی۔  
آپ اس کھڑے کا یہ تجربہ اسی صورت میں سمجھ سکتے ہیں کہ میں مکمل  
طور پر بیان کروں اور اس فن کے فنی پہلو بھی بیان کروں لیکن یہ تجربہ  
پوری کہانی سے بھی لمبا ہو جائے گا۔ میں آپ کو پہلے کئی بار بتا چکا ہوں  
کہ کھوجی بعض ایسے کھڑے بھی دیکھ لیتے ہیں جو کسی اور بلکہ تجربہ کار نقشبندی  
اشکر کو بھی نظر نہیں آتے۔ اس کھڑے کے متعلق آپ یہ ذہن میں رکھیں  
کہ یہ ایک اہم اور پیاسا سر اکر کھڑا تھا۔ کھوجی نے اپنی ہمارت اور تجربے  
کی روشنی میں یقین کے ساتھ رائے دی کہ یہ آدمی مقتول کے ساتھ تھا۔  
یہ قاتل ہو سکتا ہے۔ لیکن یہ خون؟

### آہنی پھندہ گورکھ دھندابن گیا

میں نے یہ کہانی زور سے کھوجی کے کندھے پر ہاتھ مارا کہ  
وہ دُبا پتلا ادھیڑ عمر آدمی کانپ گیا۔ میں نے جوش سے کہا "میں بتاتا  
ہوں یہ خون یہاں کیوں ہے" میں نے وہیں سے جنگل کے اہل کاروں  
کو آواز دی کہ پھندہ اپنے ساتھ لیتے آؤ۔ وہ دوڑے آتے۔ میں نے  
اُن سے پھندہ لے کر اُس کے دندانے پھر دیکھے۔ ان پر خون کے جسے  
ہوئے نشان تھے۔ میرے پچھنے پر انہوں نے بتایا کہ انہوں نے

لاش تک آیا اور لاش دیکھ کر چلا گیا لیکن وہ جدر سے آیا تھا اسے اُدھر  
ہی چلے جانا چاہیے تھا۔ کیوں سمجھئے کہ وہ شمال کی طرف سے لاش تک  
آیا اور شمال مشرق کی طرف چلا گیا۔ اُس کی دونوں سمتوں کا زاویہ تقریباً ۴۵  
ڈگری تھا۔

میں نے کھوجی سے کہا کہ یہ کوئی لاش دیکھنے آیا اور چلا گیا ہے۔  
کھوجی نے ٹکرا کر میری طرف دیکھا اور بولا "میرا تجربہ کچھ اور بتاتا ہے۔  
پہلے میں بھی یہی سمجھا تھا جو آپ کہتے ہیں۔ آگے چل کر دیکھیں۔"  
وہ مجھے ایک جگہ لے گیا جہاں زمین تھوڑی سی کھدی ہوئی تھی  
اور اس کے قریب ایک گہرا سوراخ تھا جیسے یہاں سے کڑی کاکیل  
اکھاڑے گیا ہو۔ میں نے مٹی کو غور سے دیکھا تو خون کے دوہین قطروں  
کا شک ہوا۔ کھوجی مجھے وہاں سے بارہ چودہ قدم دُور ایک درخت کے  
نیچے لے گیا۔ یہ کھڑا وہاں تک جاتا تھا۔ وہاں تین چار خون آلود کپڑے  
کے ٹکڑے پڑے تھے۔ انہیں دیکھ کر پتہ چلتا تھا جیسے کوئی اپنے زخم  
سے خون صاف کر کے یہ ٹکڑے پھینکا رہا ہو۔ یہ پگڑی کے کپڑے  
کے ٹکڑے معلوم ہوتے تھے۔ کھوجی نے جو کھڑا اٹھا یا تھا اس کا اُس نے  
یہ تجربہ کیا کہ اُس نے یہی کھڑا (اُدھورا اُدھورا اور بچا بچا) لاش کے  
ارد گرد دیکھا ہے، پھر یہ کھڑا اُس جگہ آیا جہاں زمین ذرا کھدی ہوئی تھی۔  
وہاں زیادہ تر کھڑا صرف بائیں پاؤں کا ہے جیسے یہ آدمی ایک ٹانگ  
پر چلتا رہا ہو۔ اس کے ساتھ دو کھڑے اور ہیں۔ وہاں یہ کھڑا درخت

یقین سے کہا کہ یہ شخص مقتول کے ساتھ تھا۔ میں نے پھندہ اور خون آلود کپڑے کے ٹکڑے قبضے میں لے لئے۔ دونوں اہلکاروں کو گواہوں کے طور پر پابند کر لیا اور ذہن میں یہ نقطہ رکھ لیا کہ یہ شخص جس کے یہ کھڑے اور یہ خون ہے یہ اگر قاتل نہیں تو مقتول کے ساتھ ضرور تھا۔ اس زمانے میں پولیس کی ایک مشکل یہ تھی کہ خون کا گروپ معلوم کرالے کے لئے خون کا نمونہ بہت ہی دیر بھینا پڑتا تھا۔ اس کے لئے کئی دن درکار تھے۔ یہ بھی یاد رکھیں کہ خون کا معائنہ تفتیش میں کچھ مدد دے سکتا ہے، عدالت اسے تسلیم نہیں کرتی۔ خون سے متعلقہ ماہرین صرف یہ معلوم کر کے بتاتے ہیں کہ یہ خون کسی انسان کا ہے یا کسی جانور کا۔ اگر جاتے واردات کی کسی چیز پر گرے ہوئے خون کا گروپ کسی ملزم کے خون سے مل جاتے تو پولیس کا شک اس ملزم کے خلاف پختہ ہو سکتا ہے، قانون اسے ملزم کے خلاف استعمال نہیں کر سکتا کیونکہ بے شمار انسانوں کا خون ایک ہی گروپ کا ہوتا ہے۔ بس اتنا فائدہ ہوتا ہے کہ پولیس ملزم کو پھر چھوڑتی نہیں۔ دوسری شہادتیں فراہم کر کے اس کے خلاف مجرم ثابت کر لیا جاتا ہے۔

## سب کے پاؤں دیکھے

لاش جاچکی تھی۔ میں مقتول کے گاتوں میں چلا گیا۔ گاتوں سے چند

یہ پھندہ یہیں سے اکھاڑا ہے۔ یہ ایک مہتمم تھا جو میری عقل کا امتحان لے رہا تھا۔ میں نے بہت سوچا اور دماغ میں یہی آیا کہ پھندہ جب اہلکاروں نے دیکھا اس وقت یہ بند تھا اور اس پر خون بھی تھا۔ اس سے یہ پتہ چلا کہ اس پر کسی جانور کا پاؤں آیا، پھندہ سے نے بند ہو کر پاؤں چکڑ لیا لیکن اتنا نہیں کہ جانور پاؤں نکال نہ سکے، مگر اب یہ کھڑا دیکھ کر اور کھوجی کی باتیں سن کر مجھے یقین سا ہونے لگا کہ پھندہ سے میں جس کا پاؤں آیا تھا وہ کوئی جانور نہیں بلکہ انسان تھا۔ جانور اس میں سے پاؤں نہیں نکال سکتا تھا۔ صرف انسان کو معلوم ہوتا ہے کہ بند پھندہ کس طرح کھولا جاتا ہے۔ اس انسان نے پھندہ کھولا اور پاؤں آزاد کر لیا۔

میں نے کھوجی کو جب پھندہ اور اس پر خون دکھایا اور بتایا کہ یہ پھندہ یہاں لگا ہوا تھا تو اس نے آنکھیں ضرورت سے زیادہ کھول کر میرے منہ کی طرف دیکھا اور بہت دیر دیکھتا ہی رہا۔ اس نے کھڑا ایک بار پھر دیکھا اور بولا۔ اگر اس کا پاؤں پھندہ سے میں آیا تھا تو یہ دایاں پاؤں ہو گا۔ لوہے کے اس پھندہ سے نے تو اس کی ہڈی توڑ دی ہو گی، اسی لئے اس کے دائیں پاؤں کا کھڑا باتیں سے بہت مختلف ہے۔ کہیں پنجہ لگا ہے کہیں ایڑی۔ باتیں کھڑے پر وزن زیادہ پڑ رہا ہے؟ ایک سوال میرے ذہن میں آیا۔ کیا یہ شخص قاتل تھا جو قتل کر کے ادھر سے واپس گیا اور اس کا پاؤں پھندہ سے میں آگیا؟ کھوجی نے ایک بار پھر تمام کھڑے دیکھے اور پہلے سے زیادہ

کہنے ہیں۔ ہم سن چکے ہیں کہ اُن کا لڑکا مارا گیا ہے۔ یہیں معلوم نہیں وہ کس طرح مارا گیا ہے۔ یہ درست ہے کہ دس گیارہ سال گزرے ہمارے اُن کے ساتھ لڑاتی ہوتی اور ہمارا ایک آدمی ضائع ہو گیا اور اُن کے آدمی بری ہو گئے تھے، لیکن جناب عالی! ہم اتنے کمزور نہیں ہیں کہ بدلہ لینے کے لئے دس سال انتظار کرتے اور اُن کے لڑکے کو چوروں اور بزدلوں کی طرح قتل کرتے۔ اگر لیٹے کہنا ہوتا تو ہم مقدمے ختم ہوتے ہی بدلہ لے لیتے۔“

اُس نے پہلے میری رائے پر پھر اپنے سینے پر ہاتھ مار کر کہا۔ ”وہ تو کھلی لڑاتی ہوتی تھی۔ ہمارا آدمی نہ مرنے والا تھا۔ ہم بھی نہ جاتے۔ ہم نے بدلہ لینے کی سوچی ہی نہیں۔ یہ لڑکا جو آج مارا گیا ہے اور اُن کے دوسرے لڑکے کئی دفعہ ایسی ایسی جگہ ہمیں اکیلے اکیلے ملے ہیں کہ اگر چھپ کر بدلہ لینا ہوتا تو ہم بہت پہلے اس طرح بدلہ لینے کہ انہیں پتہ بھی نہ چلتا کہ قاتل کون ہے۔ ہم نے وہ لڑاتی دل سے نکال دی ہے۔“ اُس نے ایسی باتیں کہیں اور ایسے لمحے میں کہیں کہ میں نے مان لیں۔ بعد میں نمبر دار نے بھی مجھے بڑی اچھی دلیلیں دیں اور مثالیں دے کر یقین دلایا تھا کہ ان لوگوں نے کبھی انتقام کی نہیں سوچی۔ ماہم میں نے انہیں ذہن سے خارج نہیں کیا۔ مقتول کے باپ نے ان کے خلاف پختہ شک کا اظہار کیا بھی نہیں تھا۔ اُس نے میرے اس سوال کا جواب دیا تھا کہ کس کے ساتھ خونریزی دشمنی ہے؟

ایک کھیت پر سے اُن ہندو راجپوتوں کے گھر تھے جن کے ساتھ دس سال پہلے مقتول کی لڑاتی ہوتی تھی۔ وہاں جا کر اُن کے دو معزز آدمیوں کو بلا کر کہا کہ تمام مردوں کو ایک جگہ اکٹھا کر لو۔ اگر کوئی کھیتوں میں یا کہیں اور ہے تو اُسے بھی بلا لو۔ کوئی ایک بھی غیر حاضر نہ ہو۔ میں نے نمبر دار، جو کیدار اور سفید پوش کو بلا لیا۔ ان کے سات آٹھ گھر تھے۔ کم و بیش پچیس آدمی تھوڑی دیر میں جمع ہو گئے۔ شام کا وقت تھا۔ سب گھروں کو آگئے تھے۔ نمبر دار وغیرہ نے سب کو دیکھ کر مجھے بتایا کہ کوئی بھی غیر حاضر نہیں۔ میں نے گول دائرے میں کھڑا کر کے سب کے پاؤں دیکھے کسی کا پاؤں زخمی نہیں تھا۔

اس کے بعد اُن سے پوچھ کر اُن دس بارہ آدمیوں کو الگ کیا جو مقتول کے خاندان کے ساتھ دس سال پہلے لڑے تھے۔ میں نے ابھی پوچھا بھی نہیں تھا کہ ان میں سے وہ بوڑھا زیندار جس نے دس سال پہلے پانی کا جھگڑا شروع کیا تھا، بول پڑا۔ اُس زمانے میں تھانیداروں سے لوگ خصوصاً دیہاتی لوگ، بہت ڈرتے تھے۔ کچھ سمجھ جاتے تھے لیکن اس آدمی کے لمحے میں ڈر اور خوشامد نہیں تھی۔

”جناب عالی! آپ ذرا تشریف رکھیں۔“ اُس نے کہا۔ چریشان نہ ہوں۔ میں آپ کا شک رفع کرنے کی کوشش کروں گا۔ دو آدمی دوڑ کر پلنگ اُٹھا لاتے۔ میں بیٹھ گیا۔ اُس نے کہا۔ ”اگر انہوں نے (مقتول کے لواحقین نے) ہم پر قتل کا شک کیا ہے تو وہ بزدل اور

میری مدد و نیر دار، چو کیدار اور میرے منجر ہی کر سکتے تھے۔ میر  
نمبر دار اور چو کیدار کو ساتھ لے گیا۔ تھانہ دو میل دور تھا۔ انہیں منجری کے  
لئے ضروری ہدایات دیں اور بتایا کہ کوئی ایسا آدمی دیکھو جس کا پاؤں زخم  
ہو تو فوراً مجھے اطلاع دو منجروں کو الگ ہدایات دیں۔ لاش بارہ میل دور پوٹھانم کے  
لئے گئی تھی۔ رات کے آخری پہر واپس آئی۔ مجھے پوسٹ مارٹم رپورٹ  
دوسرے دن ملی۔ ڈاکٹر نے لکھا تھا کہ موت گلا دبانے سے واقع ہوئی  
ہے۔ جسم پر اور کوئی زخم اور چوٹ نہیں تھی، سوائے پیٹ کے جو  
گدھتوں نے پھاڑا اور انٹریاں وغیرہ نکال کر کھالی تھیں۔

میری توقع کے مطابق باپ نے بیٹے کی تعزینیں شروع کر دیں۔  
اپنی تعزینوں کے سلسلے میں اُس نے بتایا کہ لڑکا اتنا شریف تھا کہ برادری  
کے دو گھرانے گھر آکر اپنی بیٹیوں کے رشتے دیتے تھے۔ کوئی ایک  
ہینہ ہوا کہ اس کی منگنی کر دی گئی تھی۔ یہ بات سن کر میرا دماغ کسی اور  
طرف چل پڑا۔ دیہات میں ایسا تو نہیں ہوتا کہ کسی لڑکی کے ماں باپ  
اپنی پسند کے لڑکے کے گھر جا کر لڑکی دیں۔ کسی کی زبانی کہہ لیا جا سکتا  
ہے۔ وہاں یہ بھی ہوتا ہے کہ کسی کی لڑکی کو ٹھکرا کر بیٹے کی منگنی نہیں  
اور کر دی جاتے تو ٹھکراتی ہوتی لڑکی کے والدین اُسے اپنی ناقابل  
برداشت توہین سمجھتے ہیں۔ اس قتل میں بھی مجھے ایسا ہی شک ہوا۔ میں  
نے مقتول کے باپ سے تفصیلی پوچھ گچھ کی۔ بہت کریدار مگر مجھے مایوسی  
ہوتی۔ اُس نے بتایا کہ دو گھرانوں کی لڑکیوں کے پیغام کسی کی معرفت  
آتے تھے لیکن رشتہ ایک تیسرے گھرانے کا قبول کیا گیا جن دو  
گھرانوں کو مایوس کیا گیا تھا اُن کے متعلق باپ نے بتایا کہ اُن کی  
جیست ایسی نہیں کہ ایسے سنگین طریقے سے انتقام لیتے۔ وہ شریف لوگ

منگنی کہیں اور دل کہیں اور...

اُس روز شام کو مقتول کے باپ کو بلایا۔ اُس کے ساتھ ہمدردی  
کی حوصلہ دیا اور اُسے کہا کہ اب وہ ہوش اور عقل ٹھکانے رکھ کر میرے  
سوالوں کا جواب دے تاکہ میں اُس کے بیٹے کے قاتل کو پکڑ سکوں۔  
اُس کے ساتھ ادھر ادھر کی باتیں کر کے اُسے ذہنی طور پر تیار کر لیا۔ اُس  
سے پہلا سوال یہ کیا کہ اُس کے بیٹے کے پاس پھندہ تھا اور کیا اُس نے  
کبھی جنگل میں پھندہ لگایا تھا؟ باپ نے بتایا کہ اُس کے پاس پھندہ نہیں  
تھا۔ میں نے اُسے بتایا کہ اگر پھندہ تھا تو وہ بتا دے، اس کی اُسے سزا  
نہیں ملے گی، اس سے شاید قاتل کی تلاش آسان ہو جاتے۔ اُس نے مجھے  
یقین دلایا کہ مقتول کے پاس پھندہ نہیں تھا۔ اُسے صرف پرندوں کے  
شکار کا شوق تھا جس کے لئے اُس نے باقاعدہ لائسنس لے رکھا تھا۔  
”لڑکے کے متعلق آپ کو کبھی شکایت ملی تھی کہ اُس نے کسی کی بیٹی

ہیں اور قریبی رشتہ داری بھی ہے۔ منگنی ایک اور گاؤں میں ہوتی تھی جو اس گاؤں سے دو لوٹے دو میل دور تھا۔

میں اتنا سمجھ گیا کہ قتل کا باعث بہت ہی خفیہ ہے اور یہ محبت اور رقابت کا ڈرامہ ہے، اور اگر یہ انتقامی قتل ہے تو مجھی اس میں کسی لڑکی کا عمل دخل ضرور ہوگا۔ مقتول کے باپ سے مجھے کچھ بھی حاصل نہ ہوا سوائے اس کے کہ مقتول کی منگنی ہو چکی تھی۔ مجھے لڑکی والوں سے کچھ نہیں پوچھنا تھا۔ اب نمبردار، جو کیدار اور مخبر ہی مجھے کچھ بتا سکتے تھے اور مجھے اپنے دماغ سے کام لینا تھا۔ ان لوگوں کو تھانے بلایا۔ نمبردار اور جو کیدار نے ایک ہی جیسی رپورٹ دی جو مختصر آہی تھی کہ مقتول اپنے چلن کا آدمی نہیں تھا۔ یہ تو میں بھی جانتا تھا کہ خوشحال اور امیر زمینداروں اور جاگیرداروں کے بیٹے اپنے آپ کو شہزادے اور اپنے سے کم درجے کی ذاتوں کے لوگوں کو اپنی زر خرید اور غلام رعایا سمجھتے تھے۔ غریب کسانوں اور مزارعوں کی بہو بیٹیوں کا شکار کھیلنے ترستے تھے۔

نمبردار نے بتایا کہ ایک غریب مزدور کی جوان بیٹی کے ساتھ مقتول کا گھرا اور درپردہ میل جول تھا۔ لڑکی کے باپ نے دو مرتبہ نمبردار سے کہا تھا کہ یہ لڑکا ان کے ارد گرد وچکر لگاتا رہتا اور ان کی لڑکی کو خراب کرتا ہے۔ نمبردار نے مقتول کے باپ کے ساتھ بات کی تھی لیکن باپ نے اپنے بیٹے کو سمجھانے کی بجائے لڑکی کے باپ کو گالیاں دیں اور کہا تھا کہ وہ اس کے بیٹے کو بدنام کرتا ہے۔ جو کیدار نے نمبردار کی تائید کی۔

انہوں نے بتایا کہ لڑکی کا سارا خاندان اینٹوں کے بھٹے پر کام کرتا ہے۔ گاؤں سے تھوڑی ہی دور اینٹوں کا ایک بھٹہ تھا۔ میں نے نمبردار اور جو کیدار سے کچھ اور باتیں پوچھیں اور یہ بھی پوچھا کہ ان مزدوروں میں اتنی بہت ہو سکتی ہے کہ عزت کے انتقام میں قتل کر دیں؟

”غیرت جاگ اٹھے تو انسان امیری غریبی اور زندگی موت کی پرواہ نہیں کرتا۔“ نمبردار کے یہ الفاظ مجھے آج تک یاد ہیں۔ ”میں یہاں تک جانتا ہوں کہ لڑکی پوری طرح مقتول کے قبضے میں تھی۔ اسے ماں باپ نے مارا بیٹا بھی تھا لیکن وہ مقتول سے ملنے سے باز نہیں آتی تھی۔ اس کا یہی علاج تھا کہ لڑکی کو ختم کر دیا لڑکے کو۔ ان مزدوروں کی بھی آخر عزت ہوتی ہے۔“

ممبروں نے بھی مقتول کے متعلق ایسی ہی رپورٹیں دیں ہیں نے ان کے مطابق گاؤں کے تین چار آدمیوں کو ذہن میں رکھ لیا اور ان سے تفتیش کا کام اپنے اے۔ ایس۔ آئی کے سپرد کر دیا، مگر مجھے ان سے کوئی سراغ ملنے کی توقع نہیں تھی۔ میں اینٹوں کے بھٹے پر چلا گیا صرف نمبردار میرے ساتھ تھا۔ وہ لڑکی اور اس کے باپ کو پہچانتا تھا۔ ایک بہت ہی لمبے چوڑے نشیب میں بہت سے مزدور، ان کی عورتیں اور بچے سانچوں میں گیلی میٹی بھر بھر کر کچی اینٹیں ایک جگہ رکھتے جا رہے تھے۔ ان لوگوں کی آگ ٹھک بستی تھی جس میں صرف جھونپڑے تھے۔ میں ان کے درمیان گھومنے پھرنے لگا۔ میں دو چیزیں دیکھ رہا تھا۔ ایک ہر مرد



نے کبھی نہیں کہی تھی۔ پھر اُس سے اس کی برادری کے آدمیوں کے متعلق پوچھا کہ کسی نے تو اسے کہا ہوگا کہ اپنی بیٹی کو باز رکھے۔ اس نے مہل سا جواب دیا۔

## اُونچی حویلیوں میں بھی ...

میں نے اس لڑکے کو بلا لیا۔ وہ تنومند جوان تھا گھبرا ہوا تھا۔ مجھے کے مالک کو الگ لے جا کر پوچھا کہ ان میں کوئی غیر حاضر تو نہیں؟ اُس نے سب کو دیکھ کر بتایا کہ سب کام پر موجود ہیں۔ اُس نے یہ بھی بتایا کہ اس قبیلے کے چند ایک آدمی دوسری جگہوں پر بھی کام کرتے ہیں۔ میں نے اسے قتل کا دن بتا کر پوچھا کہ اچھی طرح یاد کر کے بتاتے کہ اُس روز یہ آدمی یا ان میں سے کوئی اور کام سے غیر حاضر تھا؟ اُس نے وثوق سے بتایا کہ سب حاضر تھے۔ میں اس لڑکے کو اپنے ساتھ تھانے لے چلا تو نمبر دار نے مشورہ دیا کہ ان کے سب سے بڑے بیٹے اور لڑکی کو بھی ساتھ لے جاؤں۔ ان سے اندر کی باتیں معلوم ہونے کی توقع تھی۔ میں نے بیٹے اور لڑکی کو ساتھ لے لیا۔ بیٹے اس قبیلے کا سردار تھا۔ نمبر دار نے میرے لئے گھوڑے کا انتظام کر دیا تھا۔ میں نے نمبر دار کو فارغ کر دیا اور ان تینوں کو تھانے لے گیا۔

چلے جوان آدمی کو اندر بلا لیا۔ عزیز آدمی بہت ڈرا ہوا تھا۔ میں

کے پاؤں اور اُن کے چہرے۔ تھانیدار کو دیکھ کر قاتل کے چہرے کا تاثر بدلنا لازمی تھا اور قاتل کا پاؤں زخمی ہونا چاہیے تھا۔

مجھے دونوں چیزیں نظر نہ آئیں۔ نہ کسی کے چہرے کا تاثر بدلا، نہ کسی کا پاؤں زخمی تھا۔ مجھے اندازہ تھا کہ لوہے کے پھندے میں جو پاؤں آیا ہے، وہ معمولی زخمی نہیں ہوگا، وہ آدمی چلنے کے قابل نہیں گا اور اُس کے پاؤں پر پٹی بندھی ہوگی۔ ان مزدوروں کے پاؤں ٹھکے تھے۔ نمبر دار نے مجھے وہ لڑکی دکھائی۔ وہ نہ جوان اور نو لیسورت لڑکی تھی اپنی برادری کی دوسری لڑکیوں کی نسبت صاف سُھری اور قدرے الگ تھلک تھی۔ میں نے نمبر دار سے کہا کہ اس کے باپ کو الگ کر لے میں اُسے ایک طرف لے گیا۔

وہ ڈر سے کانپ رہا تھا۔ میں نے اُسے حوصلہ دیا اور اُس سے مقتول اور اُس کی بیٹی کے تعلقات کے متعلق پوچھا۔ اُس نے سب کچھ صاف صاف بتا دیا اور رو پڑا۔ مقتول کے ساتھ اپنی بیٹی کی ملاقاتوں کی اُس نے پوری تفصیل سنا دی۔ میرے پوچھنے پر اُس نے بتایا کہ اُس کی بیٹی کا رشتہ طے ہو چکا ہے لیکن لڑکا پیچھے ہٹ رہا ہے۔ اُس کے والدین کہتے ہیں کہ لڑکی ٹھیک نہیں۔ میں نے اس سے پوچھا کہ یہ لڑکا لڑکی کو پسند کرتا ہوگا؟ باپ نے کوئی تسلی بخش جواب نہ دیا۔ میں نے اُس سے یہ بھی پوچھا کہ لڑکے نے کبھی اُسے کہا تھا کہ وہ اپنی بیٹی کو زمیندار کے اس بیٹے سے ملنے سے روکے؟ باپ نے کہا کہ نہیں، ایسی بات اُس

کے بچے کو بلایا۔

”... اگر جھوٹا بلو گے تو یہاں سے باہر نہیں جاسکو گے۔“ میں نے اسے کہا۔ ”یہاں سے جیل خانے میں جاؤ گے اور ساری عمر وہیں گزارو گے۔ سب بتا دو گے تو مزے میں رہو گے۔“

میں نے اُس کے چہرے کا جائزہ لیا۔ تفتیشی افسر کے لئے ضروری ہوتا ہے کہ چہروں کی تبدیلیوں کو سمجھنے کی اہلیت رکھتا ہو۔ مجرم بھی یہ دھمکی سُن کر گھبرا جاتا ہے اور بے گناہ بھی لیکن دونوں کی گھبراہٹ میں فرق ہوتا ہے۔ میں نے اس آدمی کا چہرہ دیکھا۔ وہاں مجھے صرف خوف منظر آیا۔ اس کی آنکھیں ٹھہر گئی تھیں اور ہونٹ کانپنے لگے تھے۔ میں نے اسے منہ کی اہلیت نہ دی اور کہا۔ ”اُس آدمی کا نام بتا دو۔ مجھے یہ آدمی جو تمہارے ساتھ آیا ہے بہت کچھ بتا گیا ہے۔ قتل تم نے کرایا ہے یا ان لوگوں نے قتل کر کے تمہیں بتایا تھا؟“

وہ ڈرے ہوئے بچے کی طرح رو پڑا اور ہاتھ جوڑ کر فریادیں کرنے لگا۔ ”حضور ہم نے کل شام سنا ہے کہ زمینداروں کا چھوکر اجٹل میں مارا گیا ہے۔ ہماری اتنی جرات کہاں ہو سکتی ہے کہ دھن والوں کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی دیکھیں۔ آپ قتل کی بات کر رہے ہیں۔“

”تم نے لڑکی کے باپ سے کہا تھا کہ اپنی بیٹی کو زمیندار کے بیٹے سے نہ ملنے دے۔“

”میں نے صرف ایک بار اُسے یہ بات کہی تھی۔“ اُس نے کہا۔

نے اُس کے پاؤں پہلے بھی دیکھے تھے۔ اب پھر دیکھے۔ اُس کے پاؤں میں جوئی نہیں تھی اور اس کا کوئی پاؤں نہ تھی بھی نہیں تھا۔ جاسے واردات پر کھڑے جوئی کے تھے۔ میں نے اس سے پوچھا کہ اس کی جوئی کہاں سے؟ اُس نے جواب دیا کہ ان کے ہاں جوئی پہننے کا رواج ہی نہیں۔ مجھے یاد آگیا کہ یہ لوگ شادی اور تہوار پر جوئی پہنا کرتے ہیں۔ ان کی ایک بارتی خریدی ہوئی جوئی ساری عمر نہی رہتی ہے۔ میں نے فوراً پہچان لیا کہ یہ قاتل نہیں۔ لڑکی کا اپنا کوئی بھائی نہیں تھا۔ باپ قتل کے قابل نہیں تھا۔ میرا دماغ اب اس لائن پر کام کر رہا تھا کہ ان کی برادری نے مقتول کو قتل کرایا ہوگا۔

اس آدمی سے میں نے پوچھا کہ وہ لڑکی کو پسند کرتا تھا اور کیا وہ اسی کے ساتھ شادی کرنا چاہتا تھا؟ اُس نے جواب دیا کہ لڑکی اُسے پسند نہ کرتی لیکن زمیندار کے اس بیٹے نے اسے تحفے اور پیسے دے دے کہ اس کا دماغ خراب کر دیا تھا، اس لئے وہ اس کے ساتھ شادی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اُس نے میرے سوالوں کا جواب دیتے ہوئے بتایا کہ اُس نے لڑکی کے ساتھ کبھی بات نہیں کی تھی۔ اُس نے لڑکی کے باپ سے بھی کبھی نہیں کہا تھا کہ وہ اپنی لڑکی کو قابو میں رکھے۔ میں بہت دیر اسے گھیرنے اور اس سے کچھ اگلوانے کی کوشش کرتا رہا مگر وہ بے گناہ تھا۔ اس کے دل میں مقتول کے خلاف نہیں بلکہ لڑکی کے خلاف نفرت تھی۔ اسے میں نے باہر الگ بٹھا دیا اور اس

نے بہت بدزبانی کی ہے۔

میں نے اُسے اس لئے بخش دیا کہ مجھے وہ مجرم نظر نہ آیا۔ بہت وقت صُرف کر کے اُسے کھنگالا۔ وہ مجھے صاف نظر آیا۔ اسے بھیج کر لڑکی کو لایا۔ اُس نے مقتول کے ساتھ اپنے تعلقات پر پردہ ڈالنے کی بائبل ہی کو شش نہ کی۔ اُسے مقتول کے قتل ہو جانے کا بہت افسوس تھا۔ یہ لڑکی میری مدد کر سکتی تھی۔ میں اس سے یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ اس آدمی نے جس کے ساتھ اس کا رشتہ طے ہوا تھا کوئی دھمکی دی تھی یا کسی اور آدمی نے اسے مقتول سے ملنے سے روکا تھا یا کوئی آدمی ان کے قبیلے میں اتنا دلیر ہے جس نے مقتول کو رقابت یا غیرت کے جوش میں قتل کیا ہو؟ میں نے اپنے انداز سے اس سے پوچھنا شروع کیا۔ ساتھ ہی ساتھ میں اس کے جذبات کو بھڑکاتا بھی رہا اور اس میں انتقام کی آگ سلگانے کی کوشش کرتا رہا۔ وہ پہلے ہی بھڑکی ہوتی تھی۔ میں نے جلدی پر تیل ڈالا۔ مقتول کی تعریفیں اور اُس کے قتل پر افسوس کرتا رہا۔ اس لڑکی کی بھی تعریفیں کرتا رہا کہ اسے جانے والا اتنا خوب رو اور اتنے اُونچے خاندان کا تھا۔ میں نے لڑکی کو شرمسار نہ کیا۔

لڑکی گاڑی تلے آگئی

وہ میرے سوالوں کا جواب دیتی چلی گئی۔ اُس کے دل سے

لیکن لڑکی کی اپنی ماں لڑکی کے ساتھ ہے، وہ خود لڑکی کو بتاتی ہے کہ جاؤ وہ نکال جگہ کھڑا ہے۔ وہ لالچی عورت ہے۔ ہم نے یہ حال دیکھا تو پھر کبھی لڑکی کے باپ سے کچھ نہیں کہا۔ اگر ہمیں قتل کرنا ہوتا تو لڑکی کی ماں کو قتل کرتے۔

میں نے پھر بھی اسے ڈھیل نہ دی۔ پوچھ گچھ کے مخصوص طریقے سے تیر چلاتا رہا اور وہ روتا رہا اور رورو کر جواب دیتا رہا۔ آخر میں اس نے کہا ”حضور والا! ہم لوگوں کی نہ کوئی عزت ہے نہ ہم میں غیرت ہے ہماری کون سی عورت صاف ہے جہاں سے پیٹ بھر کھانا اور دو چار پیسے بغیر مشقت کے مل گئے ہماری عورتیں وہاں اپنی عزت دے آتی ہیں۔ ہم میں قتل کرنے کی ہمت ہوتی تو ہم رہزن اور ڈاکو بننے، آٹھ آنے روز پر صبح سے شام تک اینٹیں نہ بناتے رہتے۔ آپ نے ہمیں اس لئے تھانے بلوایا ہے کہ ہم غریب ہیں۔ ہم دونوں کی خاطر ہر کسی کی جوتیوں میں بیٹھ جاتے ہیں۔“ وہ روتا رہا تھا اور بولتا جا رہا تھا۔ بولتے بولتے وہ طیش میں آگیا۔ کہنے لگا ”ان بڑے بڑے زمینداروں کی بیٹیاں بھی ہماری لڑکی کی طرح خراب نکل آتی ہیں۔ آپ کسی اونچی جوہی میں جا کر اس طرح کسی لڑکی کو تھانے میں لا سکتے ہیں جس طرح آپ ہماری لڑکی کو لے آئے ہیں؟... ہمیں حضور! اشتباہ مجرم صرف ہم ہیں کیونکہ ہمارے بدن پر کپڑا نہیں اور پیٹ میں روٹی نہیں۔“ وہ بولتے بولتے چُپ ہو گیا۔ گھبرا کر اور ہاتھ جوڑ کر بولا۔ ”حضور والا! مجھے بخش دینا میں

میرا ڈرائنگ کیا تھا اور وہ مجھے اپنا ہمدرد سمجھ رہی تھی لیکن اس کے جوابوں سے میرا مقصد پورا نہیں ہو رہا تھا۔ اس کے جوابوں کے مطابق قاتل اس کی برادری یا قبیلے میں نہیں تھا۔ جس آدمی کے ساتھ اس کا رشتہ طے ہوا تھا وہ اتنا دلیر نہیں تھا۔ مختصر یہ کہ لڑکی نے بھی مجھے مایوس کر دیا۔ مجھے اس پر شک نہ ہوا کہ وہ کچھ چھپا رہی ہے بلکہ وہ دانت پیس پیس کر کہتی تھی کہ میں قاتل کو پکڑوں اور اس کے سامنے پھانسی دوں۔

میں دراصل ابھی تک قتل کا باعث معلوم نہیں کر سکا تھا۔ میں بالکل اندھیرے میں تھا اور مجھے نظر آنے لگا تھا کہ قاتل کا سراغ لگانا بہت ہی دشوار ہے۔ مجھے یہ یقین ہو چلا تھا کہ وہ قاتل ہی تھا جس کا پاؤں پھندے میں آیا تھا اور اُس کا پاؤں زخمی ہو گا کھوجی نے بھی کھڑوں کے تجزیے کے بعد یہی راستے دی تھی۔ ہم دونوں غلط ہو سکتے تھے کیونکہ یہ محض قیاس تھا، لیکن یہ تینے کا سہارا تھا جسے میں چھوڑنا نہیں چاہتا تھا۔ میں نے ان تینوں کو فارغ کر کے یہ کارروائی کی کہ شلے کے تمام تھانوں کو اس واردات کی تحریری اطلاع دی اور لکھا کہ معلوم ہوتا ہے کہ ملزم مفور ہے۔ اس کاغذیہ تو مجھے معلوم نہیں تھا، میں نے لکھا کہ اس کا دایاں پاؤں دندانوں والے آہنی پھندے میں پھنس کر زخمی ہو گیا ہے۔ ایسا کوئی مشکوک آدمی نظر آتے جس کا دایاں پاؤں زخمی ہو، اُسے پکڑ لیا جاتے۔

کیا ہو؟

لڑکی دفن ہو چکی تھی۔ میں نے چوکیدار اور مخبروں سے کہا کہ وہ معلوم کریں کہ لڑکی کے درپردہ تعلقات کس کے ساتھ تھے۔ چوکیدار نے وہیں اپنی رائے دے دی کہ لڑکی ایسی نہیں تھی۔ پردہ تو نہیں کرتی تھی لیکن باہر کم نکلتی تھی۔ گاؤں میں کسی کاراز چھپا رہی نہیں سکتا۔ کرتی ایسی دلی بات ہوتی تو بے نقاب ہو جاتی۔ چوکیدار نے یہ بھی بتایا کہ لڑکی کے گھر اسی کی عمر کا ایک لڑکا ہے۔ لڑکی جب بھیتوں کی طرف کبھی کبھی گھومنے پھرنے جاتی تھی تو یہ لڑکا ساتھ ہوتا تھا۔ اس کے متعلق اُس نے بتایا کہ یہ عام قسم کے لڑکوں اور مزاحوں جیسا لڑکا نہیں تھا۔ دس بارہ سال کی عمر میں اسے کہیں سے لاتے تھے۔ صاف پتھر اڑھتا تھا اور ایسے لگتا ہے جیسے ان کے گھر کا فرد ہو۔

یہ چونکہ میری واردات نہیں تھی، اس لئے میں نے لڑکی کے گاؤں جا کر تحقیقات کی ضرورت نہ سمجھی۔ چونکہ یہ مقتول کی منیگر تھی اس لئے مجھے اپنے مطلب کی کچھ معلومات حاصل کرنی تھیں۔ میں ریلوے سٹیشن پر چلا گیا اور سٹیشن ماسٹر سے لڑکی کے حادثے کے متعلق پوچھا۔ اُس نے وہی بتایا جو مجھے چوکیدار بتا چکا تھا۔ پلڈٹ فارم پر تیل کی صرف دو بٹیاں جل رہی تھیں۔ روشنی بہت کم تھی۔ لڑکی سب سے آگے والے ڈبے میں سوار ہونے لگی تھی اور گریڈی ہتھوڑا آگے جا کر گاڑی رُک گئی جب سٹیشن ماسٹر وہاں پہنچا اُس وقت دس بارہ

وقت گاڑی پر سوار ہوتے گری اور گاڑی کے نیچے آگئی، مجھے چونکا دیا۔ وہاں سٹیشن پر ایک فلی تھا جس نے لڑکی کی لاش پہچان لی اور اس کے گھر والوں کو اطلاع دی۔ چوکیدار پوری خبر لایا تھا۔ اُس نے یہ باتیں فلی سے پوچھی تھیں۔ اس کی اطلاع کے مطابق لڑکی چلی گاڑی میں سوار ہو رہی تھی۔ اس کے ساتھ گھر کا کوئی آدمی نہیں تھا۔ اُس کی جیب میں نوٹوں کی شکل میں خاصی رقم تھی لیکن ٹکٹ نہیں تھا۔ اگر یہ اطلاع صحیح تھی تو لڑکی گھر سے بھاگ رہی ہوگی۔ رات گیارہ بجے ایک معزز خاندان کی کنواری لڑکی کا گاڑی میں سوار ہونا اور اس کے ساتھ گھر کے کسی آدمی کا نہ ہونا یہی ظاہر کرتا تھا کہ وہ گھر سے بھاگ رہی تھی۔ اُس کے پاس رقم بھی تھی میرے دماغ میں کچھ سوال آتے۔

کیا لڑکی کسی ایسے آدمی کے ساتھ بھاگ رہی تھی جس کے ساتھ اس کی درپردہ میل ملاقات تھی؟  
کیا یہ آدمی قاتل ہو سکتا ہے؟  
اگر لڑکی کو کسی کے ساتھ بھاگنا ہی تھا تو مقتول کو قتل کرا لے کی کیا ضرورت تھی؟

کیا مقتول کو اس آدمی کے متعلق معلوم تھا کہ اس کی منیگر کے ساتھ اس کا تعلق ہے؟

اگر ہے تو کیا یوں نہ ہوا ہوگا کہ مقتول اور اس آدمی کی لڑائی ہوتی ہو اور اس آدمی نے موقع غیبت جان کر مقتول کو جنگل میں جاتے

تھی لیکن اس کے ہمنزل کا پتہ نہ چل سکا کیونکہ اس کے پاس رقم تو تھی ٹکٹ نہیں تھا۔

## پھندے سے لکھا، پھندے میں آگیا

میں وہاں سے بھی بالوس واپس آیا۔ دو دن اور گزر گئے۔ لڑکی کے گاؤں سے اطلاع ملی کہ لڑکی کے گھر کا وہ نوکر کہیں نظر نہیں آ رہا جس کا ذکر چوکیدار نے کیا تھا اور کہا تھا کہ وہ ان کے گھر کا فزولگتا ہے۔ مجھے یہ بھی بتایا گیا کہ وہ اُس رات سے غائب ہے جس رات لڑکی گاڑی تلے آئی تھی لیکن گھر والوں نے مشورہ کر دیا ہے کہ اُسے کام کے لئے کہیں بھیجا ہے۔ مجھے یہ سوچنا تھا کہ میں لڑکی کے متعلق اُس کے باپ سے براہ راست معلوم کروں کہ وہ کسی کے ساتھ جا رہی تھی یا اکیلی گھر سے بھاگ رہی تھی اور اُسی رات نوکر کہاں بھیجا گیا ہے؟ میں نے سوچ سوچ کر فیصلہ کیا کہ یہ معلومات درپردہ حاصل کروں جس کا ذریعہ مخبر، چوکیدار، نمبردار وغیرہ تھے۔ میرا مخبری کا نظام نہایت اچھا اور قابل اعتماد تھا۔ مجھے توقع نہیں تھی کہ لڑکی کا باپ صحیح بات بتاتے گا۔

شام کو میں مخبروں کو بلا کر انہیں ہدایت دے رہا تھا۔ میرا اسے ایس آئی رگھوناتھ بھی میرے پاس بیٹھا تھا۔ مخبروں میں ایک عورت بھی تھی جو اداکاری اور چرب زبانی میں مہارت رکھتی تھی۔ میں ابھی ان لوگوں

آدمی وہاں جمع ہو گئے تھے۔ ان میں سے کوئی بھی لڑکی کو نہیں جانتا تھا۔ لاش روشنی میں لائی گئی تو ایک ٹکلی نے پہچان لی۔ لڑکی کی دونوں ٹانگیں اور ایک بازو جسم سے الگ ہو گیا تھا۔ بکنگ کلرک نے بتایا کہ اس گاڑی کے لئے اُس سے پانچ مسافروں نے ٹکٹ لئے تھے۔ ان میں یہ لڑکی نہیں تھی۔ ایک آدمی نے دو ٹکٹ انبالہ کے لیے لئے تھے۔

اس سے ظاہر ہوتا تھا کہ لڑکی کے ساتھ یہی آدمی ہو گا جس نے دو ٹکٹ لیے تھے، لیکن یہ بھی تو ہو سکتا تھا کہ یہ آدمی کسی اور کا ساتھی ہو اور لڑکی بغیر ٹکٹ اکیلی جا رہی ہو۔ بکنگ کلرک کو اس آدمی کی شکل یاد نہیں تھی۔ روشنی کافی نہیں تھی اور بکنگ کلرک کو کسی کی شکل دیکھنے اور یاد رکھنے کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ میں اگلی رات کو گاڑی میں سوار ہوا اور اُس سیشن پر جائزہ لیا جہاں مجھے ریلوے پولیس کا وہ سب انسپکٹر مل سکتا تھا جس نے اس حادثے کی رپورٹ لکھی تھی۔ اُس سے ملا تو اُس نے لا پرواہی سے بتایا کہ اس نے کبھی دیکھا تھا کہ لڑکی اپنی غلطی سے گر کر مری ہے۔ اسے چلتی ریل گاڑی پر سوار ہونے کی کوشش نہیں کرنی چاہیے تھی۔ اسے کسی نے دھکا نہیں دیا تھا۔ گاڑی میں کوئی ریش نہیں تھا! اُس نے خود کبھی بھی نہیں کی۔ اگر خود کبھی کرنی ہوتی تو گاڑی کے پائیدان سے نہ گرتی۔ کہیں اور ریلوے لائن پر لیٹ جاتی۔ میں نے اس سب انسپکٹر کو اپنا مسئلہ بتایا۔ اُس نے کہا کہ موقع کے گواہوں نے بتایا ہے کہ لڑکی کے ساتھ کوئی آدمی نہیں تھا۔ اُس نے میری اس رات سے اتفاق کیا کہ لڑکی گھر سے بھاگ رہی

س لئے رفتار وزن اور چڑھائی اور موٹروں کی وجہ سے بہت کم تھی۔ ڈروں سے نکل کر انجن کو رفتار میں لانا تھا۔ ایک موٹر سے گاڑی ٹھہری تو ڈرائیور نے دیکھا کہ تقریباً ایک سو گز دور ایک آدمی پیٹ کے بل اس طرح لیٹا ہوا ہے کہ اس کی گردن ریل کی پٹری پر ہے اور وہ خود دونوں پٹریوں کے درمیان پڑا ہے۔ ڈرائیور نے وسیلہ بھائی لیکن وہ آدمی نہ ہلا۔ اگر گاڑی کی رفتار تیز ہوتی تو گاڑی کو روکنا ممکن نہ ہوتا۔ مال گاڑی کے ڈرائیور نے انجن کی شیم بند کر دی۔ اگر وہ اس آدمی کے اوپر سے گاڑی گزرا لے جاتا تو اس سے کوئی باز پرس نہیں ہو سکتی تھی لیکن وہ آخر انسان تھا۔ ایک تو وہ اس آدمی کو مارنے سے ڈر گیا اور اس کے بیان کے مطابق ڈرائیور کو یہ خیال بھی آگیا کہ یہ مرد وہ ہے اور کوئی اسے مار کر لاش لاتن پر رکھ گیا ہے۔

میں نے آپ کو ایسی کہانیاں سنائی ہیں جن میں کسی کو کہیں اور گلابا کر قتل کیا گیا اور رات کو لاش لاتن پر رکھ دی گئی۔ تیز رفتار گاڑی روکی نہیں جاسکتی۔ گاڑی کو کاشی گزرتی۔ قاتل خوش ہوتے کہ اب لوگ سمجھیں گے کہ یہ آدمی گاڑی کے نیچے آکر مرا ہے، مگر قاتل پھر بھی پکڑے گئے۔ اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ کسی کو ہلاک کر کے لاش کو لاتن پر رکھو اور لاش کٹ جائے تو خون نہیں نکلتا جس سے پتہ چل جاتا ہے کہ یہ آدمی پہلے مرا ہوا تھا اور اسے قتل کیا گیا ہے۔ یہ میں آپ کو اپنے تجربے کی روشنی میں بتا دوں کہ جرم کر کے کوئی سزا سے بچ نہیں سکتا۔

سے تباہ کر ہی رہا تھا کہ ایک کانٹیل آیا۔ وہ میرے تھانے کا منہ پر تھا، دس بارہ میل دور کے ایک تھانے سے آیا تھا۔ اس نے مجھے ایک بند لٹا دیا۔ کھولا اور چھٹی پڑھتی۔ یہ اس تھانے کے ایس۔ ایچ۔ او علی عمران کی تھی۔ یہ چھٹی میرے اس نوٹس کے جواب میں تھی جو میں نے ضلع کے تمام تھانوں کو بھیجا تھا کہ قتل کا لازم مفروضہ معلوم ہوتا ہے اس کی نشانی یہ ہے کہ اس کا دایاں پاؤں زخمی ہوگا۔

یہاں میں آپ کو پھر بتا دوں کہ یہ میں نے ہوا میں یا اندھیرے میں تیر چلا رکھا تھا کہ قاتل کا دایاں پاؤں آہنی پھندے میں آکر زخم ہو گیا ہے۔ یہ ایک تباہ تھا۔ اس میں دھوکا اور یقین والی کوئی بات نہیں تھی۔ یقیناً شکوک و شبہات پر ہی کی جاتی ہے۔ اس کیس میں تو مجھے ذرا ذرا سا شک بھی رہا تھا۔ سب انچیکر علی عمران نے لکھا تھا کہ ریلوے پولیس نے ایک آدمی کو ریلوے لاتن پر لیٹ کر خودکشی کرنے کی کوشش میں پکڑا ہے، اور اس آدمی کا دایاں پاؤں اس طرح زخمی ہے کہ ٹخنے اور پاؤں پر دونوں طرف کئی ایک زخم ہیں۔ یہ بلاشبہ پھندے کے دندانوں کے زخم ہیں۔

علی عمران نے بذریعہ ڈاک جواب دینے کی بجائے کانٹیل کے ہاتھ چھٹی بھیج دی تھی تاکہ مجھے جلدی مل جاتے۔ کانٹیل نے یہ تفصیل سنائی کہ مال گاڑی جا رہی تھی۔ ٹیشن سے نکلے ہی چڑھائی شروع ہو جا رہی تھی۔ علاقہ پہاڑی تھا اس لئے موٹر زیادہ تھکے۔ چونکہ یہ مال گاڑی تھی

اطلاع دے دی۔

## عزبت جی، محبت جی

میں اُسی رات کی گاڑی سے اس کانٹیل کے ساتھ علی عمران کے تھلنے جا پہنچا۔ آدھی رات گزر گئی تھی۔ اُسے جگایا اور اُسی وقت حوالات سے اس آدمی کو نکال کر کمرے میں بٹھالیا۔ علی عمران سے کہا کہ وہ جا کر سو جائے۔ میں نے ملزم سے پوچھا کہ وہ تائن پر کیوں لیٹا ہوا تھا۔

”خودکشی کے لئے“ اُس نے جواب دیا۔

”خودکشی کی وجہ؟“

”زندگی سے تنگ آ گیا ہوں۔“

”اصل وجہ بتاؤ۔“ میں نے پوچھا۔ ”کیا تنگی تھی؟ عزبت؟“

”محبت؟ کوئی اور وجہ؟“

”عزبت بھی اور محبت بھی۔“

”کس سے محبت تھی؟“

وہ خاموش رہا۔ میں نے اپنا سوال دہرایا۔ وہ پھر بھی خاموش رہا۔

میں نے اُس کے سر پر ہاتھ رکھ کر بلایا اور ایک بار پھر پوچھا کہ اُسے

کس سے محبت تھی۔

تائون کی گرفت سے بچ جاتے تو خدا اُسے کسی اور طریقے سے سزا دے دیتا ہے۔

مال گاڑی کے ڈرائیور نے انجن کی سسٹ رفتار سے فائدہ اٹھایا اور آہستہ آہستہ بریکیں لگانی شروع کیں۔ وہ آدمی بالکل نہیں ہلا۔ انجن اُس سے ایک گز دور رک گیا۔ ڈرائیور اور انجن کے دوسرے دو آدمی انجن سے کوڑے اور جب وہ اس آدمی تک پہنچے تو اُس نے سر اٹھا کر دیکھا کہ گاڑی رکی کھڑی ہے۔ وہ اٹھ کر بھاگا لیکن ڈرائیور نے اسے دور نہ جانے دیا۔ مال گاڑی کے ساتھ پولیس کی کار دھبی جا رہی تھی۔ ایک ہی سال پہلے ایک مال گاڑی کو ڈاکوؤں کے ایک گروہ نے روک کر لوٹ لیا تھا، اس لئے اس علاقے سے گزرنے والی مال گاڑیوں کے ساتھ پولیس کی مسج کار دھبی جاتی تھی۔ اس آدمی کو گارڈ کے حوالے کر دیا گیا۔ گارڈ کے کمانڈر نے اُسے اگلے سٹیشن پر ریلوے پولیس کے حوالے کر دیا۔ اس طرح وہ علی عمران کی حراست میں آتا۔

علی عمران نے اُسے اچھی طرح دیکھا تو اُس کے دانتیں پاؤں پر پٹی بندھی ہوئی تھی۔ اُس نے پوچھا کہ یہ زخم کیسا ہے تو اُس نے بتایا کہ پاؤں پر کھماڑی لگی ہے۔ میں نے اپنے نوٹس میں جو میں نے تمام تھانوں کو بھیجا تھا، یہ بھی لکھا تھا کہ ملزم کا پاؤں دندانون والے لوہے کے پھندے میں آ گیا ہے۔ علی عمران نے اُس کی پٹی کھلوائی تو یہ زخم کھماڑی کا نہیں تھا بلکہ یہ کئی زخم تھے جو دندانون کے ہو سکتے تھے۔ اُس نے مجھے



”میری آنکھوں پر جلتے ہوئے انکارے رکھ دیں۔“ اُس نے کہا۔ ”میرے ہاتھوں پر انکارے رکھ کر جلا دیں۔ اُس کا نام نہیں بتاؤں گا۔“

میں نے اُس کا لبہ دلجو خاص طور پر نوٹ کیا۔ وہ دیہاتی تھا اگر اُس کے لیے میں پولیس کا ڈر نہیں تھا۔ اس کی باتوں میں بڑک مارنے والا جوش بھی نہیں تھا بلکہ اُس کی زبان میں غم تھا اور اُس کی دلی دلی آواز میں خود اعتمادی تھی۔ میں نے اُس سے دو تین بار پوچھا کہ اُسے کس سے محبت تھی مگر اُس نے یہی جواب دیا۔ ”کبھی نہیں بتاؤں گا۔“

”کہاں کے رہنے والے ہو؟“

اُس نے جس گاؤں کا نام لیا وہ مقتول کا گاؤں نہیں تھا اور وہ اس لڑکی کا بھی گاؤں نہیں تھا۔ اُس نے ریلوے پولیس کو بھی گاؤں بتایا تھا۔ میں نے اُس سے پاؤں کے زخم کے متعلق پوچھا تو اُس نے وہی جواب دیا جو علی عمران کو دے چکا تھا۔ ”کلمہ اڑی گئی ہے۔“

میں نے اُسے کھولنے کو کہا تو اُس نے پٹی کھول دی جو ہسپتال کی پٹی نہیں عام سا کپڑا تھا۔ اس پر ہلدی کے رنگ کی دو اٹیوں کے بڑے بڑے دھبے تھے۔ میں نے اُس کا ننگا پاؤں دیکھا اور پوچھا۔ ”کلمہ اڑی دندائوں کی طرح تھی؟“

اُس نے کوئی جواب نہ دیا۔ میرے مُنہ کی طرف دیکھنے لگا۔ میں نے چونکہ وہ چھند اکیکا تھا اس لئے میرے لئے کوئی شک نہ تھا کہ یہ

پاؤں پھندے میں آیا تھا۔ ٹانگ پر ٹخنے کے دونوں طرف دندائے اترنے کے تین تین زخم تھے۔ پاؤں کے اوپر والے حصے پر بھی دندائے اترے ہوئے تھے۔ اُس کی جوتی پر بھی دندائوں کے صاف نشان تھے۔ جوتی میں دو تین سوراخ تھے۔ ایک جینے سے کچھ دن اوپر ہو گئے تھے، زخم ابھی پوری طرح ٹھیک نہیں ہوتے تھے۔ اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ وہ دسی علاج کرتا رہا تھا اور دوسری وجہ یہ کہ یہ پاؤں کے زخم تھے جن پر جسم کا وزن پڑتا رہتا تھا۔ اُس کے اس جھوٹ نے کہ کلمہ اڑی گئی ہے مجھے گہرے شک میں ڈال دیا۔

”اس پاؤں پر کلمہ اڑی نہیں لگی۔“ میں نے اُسے کہا۔ ”اب تم اپنے پاؤں پر کلمہ اڑی مار رہے ہو۔“

وہ اس محاورے کو سمجھنے کی اہلیت نہیں رکھتا تھا۔ اُن پرٹھ ہونے کے علاوہ وہ تجربے کی عمر میں ابھی داخل نہیں ہوا تھا۔ اُس کی عمر اکیس بائیس سال تھی اور وہ اچھی بھلی شکل و صورت اور بڑے اچھے جسم کا نوجوان تھا۔

لڑکی کے ساتھ یہی تھا

”یہ پاؤں قتل کے بعد پھندے میں آیا تھا یا پہلے؟“ میں نے رازداری سے پوچھا۔

وہ پیشہ ور مجرم نہیں تھا اور وہ پختہ عمر کا بھی آدمی نہیں تھا۔  
 نوجوان لڑکا تھا۔ اُس کے چہرے پر پسینے کے قطرے منظر آنے لگے۔  
 ہسکلا کر آہستہ سے بولا۔ ”مجھ سے کوئی سی قسم لے لو، میں نے لڑکی  
 کو گاڑی سے دھکے نہیں دیا تھا۔ مجھ پر جھوٹا الزام نہ لگائیں۔“  
 ”تم اُس کے ساتھ تھے پھر وہ گری کیسے؟“ میں نے اُسے جال  
 میں لیتے ہوئے کہا۔ ”اور جب وہ گر پڑی تو تم وہاں سے غائب کیوں  
 ہو گئے تھے؟“

”گاڑی چل پڑی تھی۔“ اُس نے کہا۔ ”میں پہلے اُسے سوار کرانا  
 چاہتا تھا۔ وہ گاڑی کا اگلا ڈبہ تھا۔ وہ گاڑی کے ساتھ ساتھ دوڑی۔ میں  
 اُس کے بالکل پیچھے ساتھ ساتھ دوڑ رہا تھا۔ گاڑی تیز نہیں تھی مگر بیٹ فارم  
 ختم ہو گیا۔ وہ ایسی گری کہ لڑکا لڑکی کے نیچے چلی گئی۔ میں گرتے گرتے  
 سنبھل گیا۔ مجھے اُس کی چیخ سنائی دی۔ گاڑی گزر گئی۔ میں نے اُسے  
 دیکھا۔ اُس کی دونوں ٹانگیں الگ اور ایک بازو الگ پڑا تھا۔ ذرا آگے  
 جا کر گاڑی ٹک گئی۔ شیش کی ظرف سے کچھ آدمی دوڑے آ رہے تھے۔  
 مجھے یقین تھا کہ لڑکی مر گئی ہے۔ میں وہاں سے بھاگ گیا۔“  
 یہ مجھے بعد میں معلوم ہوا تھا کہ گاڑی نے لڑکی کو گرتے اور گاڑی  
 کے نیچے جانے دیکھ لیا تھا۔ گاڑی اُسی نے روکی تھی۔  
 ”تم لڑکی کو گھر سے بھاگ کر لے جا رہے تھے؟“  
 اُس نے بے دلی سے سر ہلایا۔ وہ لڑکی کو بھاگ کر لے جا رہا تھا۔

اُس نے مجھے آنکھیں پھاڑ کر دیکھا اور اُس کے چہرے کا رنگ  
 اڑ گیا۔ بہت ہی جلدی آواز میں بولا۔ ”میں نے تو کسی کو قتل نہیں کیا۔“  
 اُس کے ہونٹ خشک ہو گئے تھے۔  
 ”یہ پاؤں پھندے میں نہیں آیا تھا۔“ میں نے کہا۔ ”جھوٹ بولو  
 گے تو ان زخموں میں نمک ڈال کر تمہیں اٹالٹھا دوں گا۔ اگر سچ بولو گے  
 تو فائدے میں رہو گے۔ میں تمہیں بچا لوں گا۔ تمہیں اس لئے گرفتار  
 نہیں کیا گیا کہ تم ریلوے لائن پر لیٹے ہوئے تھے۔ تمہارا جرم یہ ہے  
 کہ تم قاتل ہو۔“

میں نے دو ٹوک اُس کے آگے رکھ دیتے۔ یہ علی عمران نے  
 جامہ تلاشی میں اُس کی جیب سے نکالے تھے۔ میں جب یہاں آیا تو اُس  
 نے یہ ٹکٹ مجھے دیتے تھے۔ اُس کی جیب سے تھوڑی سی نقدی بھی  
 برآمد ہوتی تھی۔ یہ ٹکٹ اُس سٹیشن سے خریدے گئے تھے جہاں لڑکی  
 گاڑی سے گر کر مری تھی۔ بکنگ کلرک نے کہا تھا کہ ایک آدمی نے  
 دو ٹکٹ خریدے تھے۔ وہ آدمی یہی ہو سکتا تھا۔

”تم نے دو قتل کیے ہیں۔“ میں نے اُس کا دم ختم کرنے  
 کے لئے کہا۔ ”اس لڑکی کو تم نے گاڑی سے گرایا اور اُسے گاڑی  
 کے نیچے پھینکا تھا۔ وہاں تمہیں تین آدمیوں نے شناخت کیا تھا۔ ٹکٹ  
 باور تمہیں اچھی طرح پہچانتا ہے۔“ میں نے اُس سے پوچھا۔ ”تم نے  
 لڑکی کو کیوں قتل کیا ہے؟“

وہ بچے میں زندہ رہا

”آپ میری ساری کہانی سنیں گے؟“ اس نے التبا کے لمبے میں کہا۔ ”یہ سن کر آپ کے دل میں رجم پیدا ہو جائے گا۔ میں مرنے سے پہلے یہ کہانی ضرور سنانا چاہتا ہوں۔“

”میں پوری توجہ سے سنوں گا۔“ میں نے کہا۔

اس نے اپنے متعلق بتایا کہ وہ جالندھر کا رہنے والا ہے اور وہ کوئٹہ میں پیدا ہوا تھا۔ وہاں اس کے باپ کی بہت بڑی دکان تھی اور وہ بڑے مزے میں زندگی بسر کر رہے تھے۔ اس کی عمر سات آٹھ سال تھی جب باپ اسے اس کی ماں اور بہن بھائیوں کے ساتھ جالندھر لایا تھا۔ وہاں اس کی دادی اور دادا تھے۔ اس کی ماں کے ماں باپ مر گئے تھے اور اس کے قریبی رشتہ دار کوئی بھی نہیں تھے۔ وہ جالندھر آتے تو دادا مر گیا۔ اس کے باپ نے جالندھر والا مکان بیچ ڈالا اور اس کی دادی کو اپنے ساتھ کوئٹہ لے گیا۔ اس طرح جالندھر سے رشتہ ٹوٹ گیا۔ اس کے باپ نے کوئٹہ میں ایک پُرانا مکان خرید لیا۔ اسے یہ معلوم نہیں تھا کہ اس کے باپ نے جالندھر میں کیوں دکان نہ کھولی اور کوئٹہ کیوں چلا گیا تھا۔

اس کی عمر دس گیارہ سال ہوتی تو کوئٹہ میں وہ تاریخی زلزلہ آیا

”اُسے اپنے ساتھ لے جانے کے لئے اُس کے منگیتر کو قتل کرنا کیوں ضروری سمجھا؟“ میں نے پوچھا۔

اس نے میرے سُنے کی طرف دیکھا۔ اُس پر نیند کا اثر تو تھا لیکن وہ میرے جس جال میں آگیا تھا اس نے اُس کے دماغ کو میرے قبضے میں دے دیا تھا۔ میں نے اُس کے ساتھ ہمدردی اور پیار کی باتیں شروع کر دیں۔ اُس کا حوصلہ بڑھایا اور اُسے اقبال جرم کے لئے تیار کر لیا۔

”مجھے جلدی پچھانسی دے دو گے؟“ اُس نے پوچھا۔

”میں نہیں پچھانسی سے بچا رہا ہوں۔“ میں نے کہا۔

”اور بچا ہوں گا۔“

”یہ تو کوئی مہربانی نہ ہوتی۔“ اُس نے کہا۔ ”میں زندہ نہیں رہنا چاہتا۔“

”تمہاری ہر خواہش پوری کروں گا۔“ میں نے کہا۔ ”تمہارے لئے جو بہتر سمجھوں گا وہ کروں گا۔ پہلے مجھے سارا واقعہ سُنا دو۔ بات وہاں سے شروع کرو کہ تم نے لڑکی کے منگیتر کو کیوں اور کس طرح قتل کیا تھا۔“

اُس کی آنکھیں خشک تھیں لیکن اس موقع پر اُس کے آنسو بہنے لگے۔ وہ اطمینان محسوس کر رہا تھا۔ اُس کے ضمیر پر جو بوجھ تھا اسے ضمیر سے اتارنے میں میں اُس کی مدد کر رہا تھا۔

جس نے اتنے بڑے شہر کو بلے کا ڈھیر بنا دیا تھا۔ یہ جون ۱۹۳۵ء کا واقعہ ہے اور یہ زلزلہ مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ کونسل کی تباہی کی جو تفصیل سنی تھی وہ آج بھی یاد آتی ہے تو دل دہل جاتا ہے۔ رات کے آخری پہر زمین کے اندر بڑی غورناک گڑگڑاہٹ سنائی دی اور اتنے سخت جھٹکے آئے کہ مکان ریت کے گھروں کی طرح بیٹھ گئے۔ تمام مکان پرانے زمانے کے تھے۔ لوگ گہری نیند سوتے ہوئے تھے۔ کسی کو بھاگنے کی مہلت نہ ملی۔ بھاگتے بھی تو کہاں جاتے۔ گلیاں بلے سے بند ہو گئی تھیں۔ زلزلہ ایک ہی بار نہیں آیا۔ جھٹکوں کا سلسلہ چلتا رہا۔ اس کے ساتھ زمین کے نیچے کی گڑگڑاہٹ زمین کے اندر بھاگتی دوڑتی محسوس ہوتی تھی اور زمین پھٹ رہی تھی۔ صرف چھاؤنی کا علاقہ اور دیوبند سٹیشن محفوظ رہا تھا۔

فوج نے لوگوں کو بلے کے نیچے سے نکالنے کا کام شروع کیا۔ زیادہ تر لاشیں نکلتی تھیں۔ کہیں کہیں سے زندہ انسان بھی نکلے۔ یہ کام اتنا مشکل تھا کہ پانچ سات دنوں بعد یہ فرض کر کے کہ اب بلے میں کوئی زندہ نہیں رہا ہوگا، بلیر ہٹانے کا کام بند کر دیا گیا۔ اموات زیادہ اور بچنے والوں کی تعداد کم تھی۔ ان میں زیادہ تر زخمی تھے۔ ”مجھے اتنا ہی یاد ہے کہ ایک فوجی نے مجھے اپنے بازوؤں پر اٹھا رکھا تھا۔“ ملزم نے کہا۔ ”اور میں نے یہ محسوس کیا تھا کہ میں اب جاگا ہوں۔ زلزلے کا مجھے علم نہیں ہو سکا۔ فوجیوں نے بلے کے

قریب ہی میرے سر پر پٹیاں باندھیں۔ مجھے بعد میں پتہ چلا کہ میرے سر میں چوٹ لگی تھی اور میں نیند سے غشی میں چلا گیا تھا۔ میں رونے لگا۔ میں نے ادھر ادھر دیکھا۔ ہر طرف زخمی تھے اور لاشیں پڑی تھیں۔ میں اپنے گھر کو ڈھونڈ رہا تھا مگر وہاں کوئی مکان کھڑا نہیں تھا۔ مجھے بلے سے نکالنے والا فوجی مسلمان تھا۔ وہ مجھے بہلانے لگا۔ میں اپنی امی اور ابا کے پاس جانے کی ہند کر رہا تھا۔ یہ فوجی مجھے ایک طرف لے گیا اور دولاشوں کے منہ ننگے کئے۔ یہ میری امی اور میرے ابا کی لاشیں تھیں۔ مجھے میرے بڑے بھائی اور چھوٹی بہن کی اور دادی کی لاشیں بھی دکھائی گئیں۔ اپنے مکان میں سے صرف میں زندہ رہا تھا۔“

اس کی آواز دب گئی اور وہ سر جھکا کر ہچکیاں لیتا رہا میں نے اُس کے لئے پانی منگوایا۔ اُسے پلایا اور دلاسہ دیا۔ آپ تصور کر سکتے ہیں کہ اپنی ماں، اپنے باپ اور اپنے بہن بھائی کی لاشیں دیکھ کر دس گیارہ سال کی عمر کے بچے کی کیا حالت ہوتی ہوگی۔ اُس نے مجھے اپنی اُس وقت کی حالت سنائی۔ ایک بار تو روکنے کے باوجود میرے آنسو نکل آئے۔ اسے چھاؤنی میں لے گئے۔ یہ معلوم نہیں کہ اس طرح کے بچوں کے لئے کیا انتظامات کئے گئے تھے۔ اسے یہی معلوم تھا کہ یہ فوجی اپنے بال بچوں کے ساتھ کو اڑ میں رہتا تھا اور وہ اُسے اپنے ساتھ لے گیا تھا۔ اُس نے بچے سے پوچھا تھا کہ وہ کہاں کارہنہ

نے اس بچے کو متنی نہیں بنایا تھا بلکہ اسے اس لئے لیا تھا کہ اُس کی بچی لکھڑیوں کے ساتھ رہے گا اور خیم اور بے آسرا بچے کو پالنے کا ثواب بھی ملے گا۔ اُس نے بتایا کہ بچہ صاف سُٹھا، سُٹھیا ہوا اور خوبصورت تھا۔ وہ خوشحال زمیندار تھا۔ ایسے زمینداروں کے ہاں صرف روٹی کی خاطر لوگ خوشی سے لڑکری کرتے تھے۔ ان زمینداروں کے طور پر لیتے بادشاہوں جیسے تھے۔ اس بچے کو اسی زمیندار نے بادشاہی شغل کے طور پر رکھ لیا۔

مُزوم نے اپنے بیان میں کہا کہ ان اجنبی لوگوں میں اور اس ماحول میں وہ اتنا گھبراہٹ کا ہر وقت وہاں سے بھاگنے کی سوچتا رہتا مگر اُسے جب باب، وادی، ماں اور بہن بھائی کی لاشیں یاد آئیں تو اُسے ایسے لگتا جیسے کسی نے اس کا گلا مضبوط ہاتھوں میں دبا لیا ہو۔ کہاں کو تیرے کا شہر اور کہاں یہ دیہاتی ماحول۔ بچہ بڑے اچھے سکول میں پڑھتا تھا۔ یہاں گاؤں میں پڑھنے پڑھانے کا رواج ہی نہیں تھا۔ اسے گاؤں کے بچے گندے لگتے تھے اور اسے وہاں کی ہر چیز سے ڈرتا تھا۔ زمیندار اور اُس کی بیوی نے اسے اپنے بچے کی طرح رکھا۔ اسے اچھے کمرے میں سلاتے تھے اور اسے اپنی بچی کے ساتھ کھانا دیتے تھے۔ زمیندار کی بچی بھی اس کے ساتھ اچھا سلوک کرتی تھی اور اسے اپنے ساتھ لگاتے رکھنے کی کوشش کرتی تھی۔ وہ اس کی ہم عمر تھی وہ آخر بچہ تھا۔ اس کا ذہن اس ماحول اور اس کے سالانوں کو قبول کرنے لگا۔ سب سے بڑی ضرورت شفقت اور پیار ہے۔ بچے کی یہ ضرورت

والا ہے۔ بچے نے بتایا تھا کہ اُس کے والدین جالندھر کے رہنے والے تھے لیکن جالندھر میں اُن کا اپنا عزیز رشتہ دار کوئی نہیں رہا۔

## لڑکی نے اسے لو کر نہ سمجھا

تین چار ماہ بعد یہ فوجی اسے اپنے گاؤں لے آیا۔ وہ چھٹی اہا تھا اور وہ اُس وقت صوبیدار تھا۔ اُس کے متعلق مُزوم نے بتایا کہ اُس کے بچے تھے اور وہ اُس کے ساتھ اپنے بچوں کی طرح پیار کرتا تھا۔ صوبیدار اسے جس گاؤں میں لایا وہ اس لڑکی کا گاؤں تھا جو گاڑی سے گر کر کٹ گئی تھی۔ صوبیدار اُن کا قریبی رشتہ دار تھا۔ میں قتل کی جرم وار دات سنار ہا ہوں یہ ۱۹۴۴ء کی ہے۔ یہ صوبیدار اُس وقت زندہ نہیں تھا۔ دو سال پہلے برما فرنٹ پر مارا گیا تھا۔ وہ بچے کو کونستے سے لے آیا اور گاؤں والوں کو سنایا کہ اپنے خاندان میں یہ اکیلا بچہ زندہ بچا ہے اور اسے وہ رحم کے جذبے سے لے آیا ہے۔ گاڑی کے نیچے آنے والی لڑکی کے باپ نے صوبیدار سے بچہ لے لیا۔ اُس وقت لڑکی کی عمر اس بچے جتنی تھی، یعنی دس گیارہ سال۔ لڑکی کے باپ کے ساتھ حادثہ یہ ہو رہا تھا کہ اس لڑکی کے سوا اُس کی کوئی اولاد نہیں تھی۔ دونے پیدا ہوئے اور مر گئے تھے۔ اُس نے صوبیدار سے یہ بچہ لے لیا۔ بعد میں جب میں نے لڑکی کے باپ کے بیان لئے تھے تو اُس نے بتایا تھا کہ اُ

پوری ہو رہی تھی۔ یہ تو ہونہیں سکتا تھا کہ اُس کے ذہن سے اُس کے ماں باپ کی اور کوٹہ کی زندگی کی یاد اُتر جاتی۔ اُسے جب یہ یادیں آتی تھیں تو اُس کے لئے سنبھلنا اور اپنے آپ کو قابو میں رکھنا ناممکن ہو جاتا تھا۔ وہ زمیندار کی بیٹی کے ساتھ کھیلا کرتا تھا۔ بچی اُس کی دلی کیفیت کو سمجھنے لگی تھی۔ ایک روز اس بچی نے اُسے کہا کہ وہ اسے کوٹہ کی باتیں سُنا رہی تھی۔

بچے نے اُسے پوری تفصیل سے سُنا یا کہ اس کی ماں کیسی تھی باپ کیسا تھا، انھی سی بہن کیسی تھی اور اس کا گھر کیسا تھا اور وہ کتنے اچھے کپڑے پہنا کرتا تھا۔ اُس نے شہر کی زندگی ایسے انداز سے سُنا تی کہ بچی کے مُنہ سے بے اختیار نکل گیا۔ ”یہ گاؤں تو بڑے گندے ہیں۔ ہم بڑے ہوں گے تو ہم دونوں کسی شہر میں چلے جائیں گے۔“ بچے کو بچی کی یہ بات بہت پسند آتی بلکہ اس کے دل میں بیٹھ گئی۔ اس کے بعد بچے نے اُسے کوٹہ کی تباہی کی داستان سُنا تی۔ یہ اتنی بھانک اور ہولناک تھی کہ بچی ڈر کر اس کے قریب ہو گئی۔ بچے کے آنسو نکل آئے۔ بچی کے دل میں بچے کی محبت اور زیادہ گہری ہو گئی۔ اس محبت میں ہمدردی زیادہ ہوتی

جب دونوں جوان ہوئے تو ...

یہ دونوں گھر میں بھی کھیلے، کھیتوں میں بھی چلے جاتے اور

وقت گزرتا چلا گیا۔ مُلُز لباس اور عادات کے لحاظ سے دیہاتی بنتا چلا گیا۔ اسی علاقے کے لب و لہجے میں دیہی کی زبان بولنے لگا۔ ”لیکن کوٹہ اور اپنا گھر اور اپنے ماں باپ اور بہن بھائی دل سے نہیں اُترتے تھے۔“ مُلُز نے تھانے میں مجھے بیان دیتے ہوئے کہا۔ ”ان سب کی لاشیں آنکھوں کے سامنے رہتی تھیں۔ میں کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا۔ غصہ آتا تھا اور دل پر غم کا بوجھ رہتا تھا۔ یہ لڑکی اتنی اچھی تھی کہ مجھے زیادہ دیر تلگین نہیں رہنے دیتی تھی۔ اسے اور کچھ کہنا نہیں آتا تھا تو یہی کہہ دیتی تھی کہ ہم بڑے ہو کر شہر چلے چلیں گے۔“

دونوں پندرہ سولہ سال کی عمر کو پہنچے تو مُلُز گھر کے کام بھی کرنے لگا۔ دیہات میں فصل اُٹھانے، بازار چھوانے وغیرہ سے متعلق کام قابلِ اعتماد اور عقل مند لڑکے کیا کرتے ہیں۔ زمین جانتا اور والوں کے کئی کام ایسے ہوتے ہیں جو ہر لڑکے سے نہیں کرا سکتے جاتے۔ یہ کام آہستہ آہستہ مُلُز کے پُروہ ہونے لگے اور وہ دلچسپی سے کرنے لگا۔ اُس کی حیثیت گھر کے فروغ بھی ہو گئی اور لڑکے کی بھی۔ لڑکی اب جوان ہو گئی تھی۔ وہ اب مُلُز کے ساتھ پہلے کی طرح کھیل نہیں سکتی تھی لیکن مُلُز کے ساتھ اُس کی دلچسپی پہلے سے زیادہ ہو گئی۔ وہ اُس کے کھانے پینے کا اور کپڑوں کا غور و خیال رکھتی تھی۔ چونکہ ماں باپ کی اکلوتی بیٹی تھی اس لئے لاڈلی تھی۔ ماں باپ اس کی ہر بات مانتے تھے۔ انہوں نے جوان ہونے کے باوجود بیٹی کو لڑکے کے ساتھ اتنا زیادہ بے تکلف

لڑکی اکثر ادھر ادھر جانے لگی۔ وہ سیر کی اتنی شوقین نہیں تھی، وہ ملزم کو اپنے ساتھ رکھنا چاہتی تھی۔ ملزم نے مجھے بتا کر راستے میں وہ رُک جاتی اور اسے پاس بٹھا کر دل کی باتیں کرتی اور سنتی تھی اور کبھی تو وہ بچی بن جاتی اور کہتی کہ میں بھاگتی ہوں تم مجھے پکڑو۔ ملزم اُس کے پیچھے دوڑتا اور تھوڑی دُور جا کر اُسے پکڑ لیتا۔ لڑکی اُس کے ساتھ لیٹ جاتی۔ کبھی گر پڑتی اور ملزم کو اپنے اوپر گرا لیتی لیکن اُس کا انداز بچپن والا ہوتا تھا۔

### لڑکی کی منگنی کہیں اور ہو گئی

ملزم نے مجھے بہت سی باتیں سنائیں جن سے ظاہر ہوتا تھا کہ لڑکی اس کے بغیر خوش نہیں رہتی تھی اور اسے زیادہ سے زیادہ وقت اپنے ساتھ لگاتے رکھنے کے موقعے پیدا کرتی رہتی تھی۔ مجھے اُس کی اتنی زیادہ باتیں سننے کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ ہر ایک بات مجھے سنا کر شاید سکون محسوس کر رہا تھا۔ میں نے اکتاہٹ کا اظہار نہ کیا بلکہ ایسا روئیہ اختیار کر لیا جیسے میں اُس کا بے تکلف دوست ہوں۔ مجھے جب یاد آتا تھا کہ میں تھانہ دار ہوں تو میں بے تاب ہو جاتا کہ وہ فوراً قتل کا اقبال کر لے، اور جب میں ایک عام انسان کی حیثیت سے اُس کی طرف توجہ دیتا تھا تو میری تمام تر ہمدردیاں اُس کے ساتھ ہو جاتی تھیں۔ مجھے اُس پر رحم آتا

ہونے سے نہ روکا۔ اب اُن کی بے تکلفی کا رنگ بدل گیا تھا۔ تنہائی میں ہو تے تو لڑکی بعض اوقات شرماتی تھی۔ لڑکے کے ذہن سے کوٹہ اور شہری زندگی نکلی نہیں تھی۔ اب وہ بھلا بُرا سوچ سکتا تھا اور اُس نے یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ گاؤں میں نہیں رہے گا لیکن لڑکی اُس کے بازوؤں کی زنجیر بن گئی تھی۔ ان کے بچپن کے کھیل اب جوانی کا کھیل بن گیا تھا جسے پردوں میں چھپ کر کھیلا جاتا ہے۔ ملزم نے خدا اور قرآن کی فتیوں کھا کر کہا کہ اُن کی محبت بالکل پاک تھی اور دونوں نے کبھی ایسی ویسی بات نہیں سوچی تھی۔ ملزم کو یہ پورا احساس تھا کہ لڑکی کے گھر والے اُس پر اعتبار کرتے ہیں۔ لڑکا شہری ماحول اور شائستگی گھرانے کا پروردہ تھا لیکن اس پر دیہاتی پن غالب آچکا تھا۔ وہ دلیر اور اکھڑ بن گیا۔ تعلیم سے وہ بے بہرہ رہا تھا۔ یہ اثرات بھی تھے کہ اس لڑکی کو وہ اپنی ملکیت سمجھنے لگا۔ اُسے اپنی ملکیت کا تاثر لڑکی نے ہی دیا تھا۔ لڑکی لاڈلی ہونے کی وجہ سے ضدی اور اکھڑ تھی۔ صرف ملزم کے آگے وہ جھکتی اور اس کی ہر بات ماننی تھی۔ ملزم نے یہ کسی بھی وقت نہ سوچا کہ اُن کی محبت کا انجام کیا ہو گا۔ وہ جب اور بڑے ہوتے تو سب کے سامنے ہنسنے کھیلنے سے گریز کرنے لگے لیکن ان کا میل جول رُک نہ سکا۔ ایک سہولت گھروالوں نے خود ہی دے رکھی تھی۔ لڑکی کو اپنے رشتہ داروں کے ہاں دوسرے گاؤں جانا ہوتا تو ملزم کو اُس کے ساتھ بھیجا جاتا تھا۔ لڑکی گھوڑی پر ہوتی اور لڑکا پیدل۔

تھا، پھر میں اُس کا ہمراز دوست بن کر اُس کی باتیں ہمدردی سے سُنتا اور دلچسپی کا اظہار بھی کرتا تھا۔ وہ اپنے ماں باپ کا بڑا پیارا بچہ تھا مگر اس گاؤں میں لوگ اسے اس زمیندار کا نوکر کہتے تھے۔

دو دنوں کی عمر میں اُس سال ہو گئی۔ ایک روز لڑکی نے اُسے بتایا کہ ماں باپ اُس کی شادی کی باتیں کر رہے ہیں اور میں گھروں سے پیغام آرہے ہیں۔ مَزم کو ایسے لگا جیسے کوئی کازلزلہ ایک بار پھر آگیا ہو۔ دو دنوں نے کبھی نہیں سوچا تھا کہ ان کی شادی نہیں ہو سکتی اور لڑکی برادری کے کسی گھر میں جاتے گی۔ مَزم پر غم کا ایسا بوجھ پڑا کہ وہ بچہ کے رہ گیا۔ لڑکی نے اپنی ماں سے کہا کہ وہ مَزم کے ساتھ شادی کرنا چاہتی ہے۔ ماں ابھی تک سمجھ رہی تھی کہ اُس کی بیٹی ابھی بچی ہے اس لئے اُسے معلوم نہیں کہ وہ کیا کہہ رہی ہے۔ ماں نے اُسے سمجھایا بھجایا کہ اگر اُس کے باپ کو پتہ چل گیا تو وہ مَزم کو گھر سے نکال دے گا اور ہو سکتا ہے کہ کسی شک میں وہ مَزم کی پٹائی بھی کر دے۔

لڑکی نے یہ باتیں مَزم کو سُنائیں اور کہا کہ وہ کسی اور کے ساتھ شادی نہیں کرے گی۔ مَزم نے اُسے کہا کہ ماں باپ نے اُسے بڑے لاڈ اور پیار سے پالا پوسا ہے اور اُس کی شادی کے نہ جانے کیسے نیک خواب دیکھتے رہے ہیں اس لئے وہ ان کی امیدوں اور خوابوں پر اس طرح پانی نہ پھیرے۔ مَزم نے اُسے یہ بھی کہا کہ میں گاؤں سے چلا جاتا ہوں۔ لڑکی نے کہا کہ تم چلے جاؤ گے تو میں بھی یہاں نہیں رہوں گی۔ محقر

یہ کہ وہ دونوں ایک دوسرے کی زنجیروں میں جس بڑی طرح جکڑے گئے تھے انہیں توڑنا ان کے بس کی بات نہیں رہی تھی۔

پھر لڑکی کی منگنی ہو گئی۔ دیہاتی معاشرے میں لڑکیوں کی پسند اور مرضی کون دیکھتا ہے بلکہ اسے جرم سمجھا جاتا ہے۔ مَزم کا ردِ عمل یہ تھا کہ اُسے عقدہ آنے لگا۔ عقدے والی بات نہ ہوتی تو بھی اُسے عقدہ آ جاتا۔ موٹھیوں کو بلا وجہ مارتا اور لڑکی اس کے ساتھ بات کرتی تو اُس کے ساتھ بے رحمی سے بولتا اور کبھی اُسے ڈانٹ بھی دیتا۔ لڑکی نے اپنے باپ کی ڈانٹ کبھی برداشت نہیں کی تھی لیکن مَزم کی ڈانٹ سُن کر وہ سر جھجکا لیتی اور اکیلے جا کر روتی رہتی۔ ایک روز لڑکی نے اسے کہا کہ منگنی اُس نے خود نہیں کرائی، اُسے بتاتے بغیر کی گئی ہے اور وہ مَزم کے ساتھ گھر سے بھاگ جانے کو تیار ہے۔ مَزم کو یہ اقدام پسند نہیں تھا کیونکہ لڑکی کے ماں باپ اس پر بھروسہ اور اعتماد کرتے تھے اور انہوں نے اسے اپنے بچوں کی طرح پالا اور پیار کیا تھا۔

لڑکی کی منگنی مقتول کے ساتھ ہوتی تھی جو ڈوڑھ دویل دُور گاؤں کا رہنے والا تھا۔ اس کے متعلق لڑکی کو اپنے گاؤں کی دو تین لڑکیوں سے پتہ چلا کہ چال چلن کا اچھا نہیں اور بچھنے پر کام کرنے والی ایک مزدور لڑکی کے ساتھ اُس کا میل جول ہے جس نے اُسے بہت بدنام کر رکھا ہے۔ پھر لڑکی کو یہی کچھ پتہ چلا کہ اُس کا منگیتر آوارہ اور بدکار ہے اور اُسے صرف شکار کا شوق ہے۔ لڑکی تو دیے بھی اُسے قبول نہیں کر رہی تھی،



”مجھے صرف تمہاری عزت کا خیال آتا ہے۔“ ملزم نے کہا۔  
”لوگ تمہیں بدنام کر دیں گے۔“

”میری عزت تمہارے اتھ ہے۔“ لڑکی نے کہا۔ ”میں اپنے  
ماں باپ سے کچھ نہیں کہوں گی۔ یہ بات انہیں بتاؤں گی تو وہ اس پتے  
کی طرف داری کریں گے۔ آئندہ تم اس کا یہ رعب برداشت نہ کرنا۔“

### منگیتر کے پاس بندہ وق بھی

لڑکی کی حوصلہ افزائی اور اس کی محبت نے جلتی پرنیل کا کام کیا۔  
ملزم پہلے ہی غصے سے بھر کا رہتا تھا۔ دوسرا موقع جلدی آگیا۔ لڑکی لڑکیوں  
کے ساتھ سیر سپاٹے کے لئے کھیتوں میں گئی۔ وہ ملزم سے کہہ گئی تھی کہ  
وہاں آجانا۔ وہ کسی بہانے چلا گیا۔ لڑکی لڑکیوں سے الگ ہو کر اس کے  
ساتھ باتیں کر لے گی۔ ادھر سے لڑکی کا منگیتر (مقتول) گھوڑے پر سوار  
ادھر آ نکلا۔ اس نے ان سے کچھ دور گھوڑا روک کر ملزم کو آواز دے کر  
اپنے پاس بلایا اور اسے ماں کی گالی دے کر کہا۔ ”میں نے تمہیں کہا  
تھا کہ میں تمہیں اس گھر سے نکلوا دوں گا۔ اب اگر زندہ رہنا چاہتے ہو  
تو کل سورج غروب ہونے سے پہلے اس گاؤں سے نکل جاؤ۔ اگر نہ گئے  
تو گاؤں سے باہر قدم نہ رکھنا۔ تمہاری لاش کسی کو ملے گی نہیں۔“ یہ کہہ  
کر وہ چلا گیا۔

اس کے متعلق یہ باتیں سنیں تو وہ اور زیادہ پریشان ہوتی۔ اس نے ملزم  
کے ساتھ بات کی اور پھر کہا کہ چلو بھاگ چلیں۔ ملزم رضامند نہ ہوا۔

ایک روز گاؤں کے ایک آدمی نے جو اس کا دوست تھا ملزم سے  
کہا کہ لڑکی کا منگیتر کہتا ہے کہ میں اس آدمی (ملزم) کو اس گھر سے نکلوا  
دوں گا کیونکہ میں نے سنا ہے کہ یہ میری منگیتر کے ساتھ ساتھ رہتا ہے اور  
اسے ورغلا رہتا ہے۔ یہ سن کر ملزم طیش میں آگیا۔ پھر ایک روز منگیتر  
اور ملزم کا آمناسا منا کھیتوں میں ہو گیا۔ ملزم اپنے گاؤں کے کھیتوں میں  
تھا۔ لڑکی کا منگیتر وہاں آگیا اور اسے شہزادوں کی طرح رعب سے کہا۔

”اوتے! تم نوکر ہو یا اس (لڑکی) کے چپا کے بیٹے ہو۔ پھر کبھی اس کے ساتھ  
باہر نکلے تو خون پی لوں گا۔ تم ہمارے نوکر ہو۔ وہ میری منگیتر ہے۔ تم اپنے  
آپ میں رہو۔ شادی کے بعد ہمیں مولیشیموں والے مکان میں رکھوں گا۔“  
ملزم نے کوئی جواب نہ دیا لیکن اپنے کھو لئے ہوئے خون اور غصے  
پر قابو نہ رہا اس کے لئے مشکل ہو گیا۔ اس نے لڑکی کو بتایا۔ لڑکی نے ملزم  
کو ڈانٹ کر کہا۔ ”تم نے یہ بے عزتی کس طرح برداشت کر لی؟ تم خاموش  
کیوں رہے تھے؟“

”اس لئے کہ میں اس گھر میں نوکر ہوں۔“

”جس دن تمہیں اس گھر میں کسی نے نوکر کہا اس دن نہ تم اس گھر  
میں رہو گے نہ میں رہوں گی۔“ لڑکی نے اسے کہا۔ ”پھر کبھی وہ لفظ کا تم  
سے ایسی بات کرے تو ہماری ذات کے مرووں کی طرح اس کا منہ توڑ دو۔“

منگیترا کا یہ چیلج سمایا ہوا تھا کہ کل سورج غروب ہونے سے پہلے اس گاؤں سے نکل جاؤ، ورنہ کسی کو تمہاری لاش بھی نہیں ملے گی۔ کل "کا سورج غروب ہو کر اگلے دن کا سورج طلوع ہو چکا تھا، اس لئے ملزم یہ سمجھا کہ اس کا دشمن اُسے کھیتوں میں دیکھنے نکلا ہے۔ وہ گاؤں میں آکر تو اُسے قتل نہیں کر سکتا تھا۔

ملزم نے گھر سے دکھلاڑی لی نہ چھری چاقو لیا، پاگل پن یا اکھڑ پن کی کیفیت میں خالی ہاتھوں کھیتوں کو چلا گیا۔ اُس پر دراصل وہی پاگل پن سوار تھا جو قتل یا خودکشی سے پہلے طاری ہوا کرتا ہے۔ وہ مرنے نہیں بلکہ مارنے جا رہا تھا۔ یہ اس نے سوچا ہی نہیں تھا کہ وہ مارے گا کیسے۔ اگر آپ اس کی اس حرکت کا نفسیاتی تجزیہ کریں تو صاف پتہ چلے گا کہ اس کے لاشوں میں خودکشی تھی جو بعد میں اس نے گاڑی کے آگے لیٹ کر کرنے کی کوشش کی تھی، وہ کھیتوں میں گیا تو مقتول اور حرا آنے کی بجائے دوڑ جنگل کی طرف جا رہا تھا۔ تب اُسے خیال آیا کہ وہ تو شکار کو یا کہیں اور جا رہا ہے۔ آگے درختوں کی بہتات تھی۔ کہیں کہیں گھاس اُونچی تھی اور اُونچی نیچے ٹیکر یاں بھی تھیں۔

### منگیترا کی گردن انگلیوں کے شکنجے میں

ملزم چُپ چُپ کر مقتول کے پیچھے گیا۔ پھر اُسے بندوق فائر ہونے کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ ملزم جنگل میں چلا گیا۔ وہ چُپ چُپ کر مقتول

ملزم وہیں کھڑا اُسے دیکھتا رہا۔ لڑکی پر سے چلی گئی تھی۔ رسم و رواج کے مطابق وہ اپنے منگیترا کے ساتھ بات نہیں کر سکتی تھی۔ ملزم کے اندر ایسی پہل بپا ہو گئی جسے وہ میرے سامنے اچھی طرح بیان نہ کر سکا۔ میں اُس کی اُس وقت کی جذباتی کیفیت سمجھ گیا۔ اس نے لڑکی کے منگیترا کا چیلج قبول کر لیا تھا اور غور کئے بغیر اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ اپنی بے عزتی کا انتقام لے گا۔ اس کے اندر جو غفہ بھرا رہتا تھا وہ اس فیصلے کے ساتھ ہی سکون اور اطمینان میں بدل گیا۔ لڑکی نے اس سے پوچھا کہ اُس نے کیا کہا تھا۔

"تم نے ایک روز مجھ سے کہا تھا کہ پھر کبھی لفظ کا ایسی بات کرے۔ تو تمہاری ذات کے مردوں کی طرح اُس کا منہ توڑ دو۔" اس نے لڑکی سے کہا۔ "اب میں مردوں کی طرح اُس کا منہ توڑ کر تمہیں بتاؤں گا کہ اُس نے کیا کہا تھا۔"

جیسا کہ آپ کو بتا چکا ہوں کہ ملزم دو بہات کے رنگ میں رنگا گیا تھا۔ اس نے بے عزتی کا بدلہ لینے کا وہی فیصلہ کیا جو ان پڑھ دیہاتی کیا کرتے ہیں۔ اس پر عمل کرنے کا اُسے موقع تیسرے ہی روز مل گیا۔ اس نے دُور سے دیکھا کہ لڑکی کا منگیترا گھوڑے پر جنگل کی طرف جا رہا ہے۔ اُس کے ہاتھ میں بندوق تھی۔ ملزم نے یہ سمجھنے کی بجائے کہ وہ شکار کے لئے جا رہا ہے، یہ سمجھا کہ منگیترا اُسے کھیتوں میں دھونڈنے نکلا ہے اور وہ اسے وہاں کہیں نظر آگیا تو اسے گولی مار دے گا۔ ملزم کے دماغ میں

کی گردن کے صحیح مقام پر نہ رکھے۔ مقتول بہت تڑپا۔ پہلے اُس کے ہاتھ سے بندوق گری، پھر اُس کا جسم ڈھیلا ہوا اور پھر اُس کا جسم بے جان ہو گیا۔ ملزم نے اُسے چھوڑا تو مقتول گر پڑا۔ ملزم وہاں سے چل پڑا۔ وہ اب دوسری طرف جا رہا تھا۔ میرے کھوجی نے کھڑا ٹھیک اٹھایا تھا۔ جاتے واردات تک ملزم کے کھڑے کسی اور سمت سے آتے تھے اور واپس دوسری سمت سے گئے تھے اور یہ کھڑے سیدھے آہنی پھندے میں گئے۔

ملزم کچھ دور جا رہا تھا اور پیچھے دیکھا کہ مقتول اٹھا تو نہیں۔ وہ نہیں اٹھا تھا۔ ملزم نے ادھر ہی دیکھتے پیچھے کو قدم اٹھاتے۔ پھر سیدھا چلنے لگا۔ دوسرا قدم زمین پر رکھا ہی تھا کہ اچانک اس کے پاؤں کے نیچے بڑی زور سے تڑاخ ہوتی اور اس کا دایاں پاؤں پھندے کے نوکدار دانتوں میں جکڑ گیا۔ دندلے اس کے ٹخنے میں اتر گئے۔ اس نے نیچے دیکھا۔ پھندا گھاس میں چھپا ہوا تھا۔ گھاس ہرنوں کے لئے رکھی گئی تھی۔ ملزم نے اس قسم کا پھندا دوہین باز دیکھا تھا۔ قریب ہی اسے لمبو تراسا پتھر نظر آیا۔ اس کی مدد سے اس نے پھندے میں سے اپنا پاؤں نکال لیا۔ وہ پھندے کو کھولنا جانتا تھا۔ پاؤں نرمی ہو گیا۔ کچھ پرے جا کر وہ ایک درخت کے نیچے بیٹھا اور اپنی پگڑی پھاڑ کر خون صاف کرنے لگا۔ پھر اس نے زخموں پر میٹھی ڈالی اور پگڑی سے پٹی پھاڑ کر باندھ دی۔

کو ڈھونڈتا رہا۔ ایک جگہ اُس نے مقتول کا گھوڑا بندھا دیکھا۔ اُس وقت اُسے خیال آیا کہ وہ تو خالی ہاتھ آیا ہے۔ اس نے اپنے آپ سے کہا۔ ”دیکھا جاتے گا۔“ اور وہ آگے چلا گیا۔ اچانک قریب ہی گولی فائر ہوتی۔ ملزم بدک گیا۔ اُس نے دیکھا کہ پندرہ بیس گز دور ایک درخت کی اوٹ سے مقتول نے کسی پرندے پر فائر کیا تھا اور آگے آکر درخت سے گرے ہوئے پرندے کو اٹھا رہا تھا۔ اُس نے ملزم کو دیکھ لیا۔

”یہاں کیا کر رہے ہو؟“ مقتول نے ملزم سے پوچھا۔  
”تم نے کہا تھا کہ گاؤں سے نکل جاؤ۔“ ملزم نے کہا۔ ”میں گاؤں سے نکل آیا ہوں۔“ وہ اُس کے قریب چلا گیا۔

”تو جاؤ، دفع ہو جاؤ۔“ مقتول نے کہا۔ ”مکین ذات کو اونچی عوٹ میں رہنے کا کوئی حق نہیں۔“ مقتول نے ذرا سوچ کر کہا۔ ”کچھ پیسے لے جاؤ۔ یہ نہ کہنا کہ میں نے تمہیں خالی ہاتھ رخصت کیا تھا۔“

ملزم کو یہ معلوم تھا کہ مقتول کے پاس ایک نالی والی بندوق ہے اور اس کا کارٹوس فائر ہو چکا ہے۔ اُس نے آگے بڑھ کر مقتول کے سینے پر ہاتھ مارا اور کہا۔ ”نہیں گاؤں سے جا رہا ہوں نہ تمہاری بارات ہمارے گاؤں میں آئے گی۔“

مقتول نے حیرت زدہ ہو کر اسے دیکھا۔ ملزم نے مجھے بیان دیتے ہوئے کہا کہ وہ خود اپنی پھرتی پر حیران ہے کہ وہ مقتول کے پہلو کو ہٹوا اور اُس کی گردن اپنے ہاتھوں میں جکڑ لی۔ اس نے دونوں انگوٹھے مقتول

## لڑکی گاڑی تلے کٹ مری

ایک مہینہ گزرنے کو آیا تو ان دونوں کو یقین ہو گیا کہ اب پولیس اُن پر شک نہیں کرے گی اور پاؤں بھی پہلے سے بہتر ہو گیا تھا۔ ان دونوں نے پاؤں کا زخم کامیابی سے چھپاتے رکھا تھا۔ لڑکی نے گھر سے بہت سی رقم چرا کر اپنے پاس رکھ لی۔ زلیو رات اس لئے زچہ راتے کہ جہاں کہیں فروخت کئے پچڑے جاتیں گے جذبات میں آکر گھروں سے بھاگنے والے یہ نہیں سوچا کرتے کہ جاتیں گے کہاں اور کس سے کیا اور یہیں گے کہاں۔ جوان اور خوبصورت لڑکی کو ساتھ لے کر بھاگنا اور زیادہ خطرناک ہوتا ہے۔ انہوں نے کچھ بھی نہ سوچا اور ایک رات جب گھر والے سو گئے تو پہلے لڑم باہر نکلا اور گاؤں سے نکل گیا، پھر لڑکی نکلی اور بس سے جا ملی۔ اندھیرے نے انہیں چھپاتے رکھا اور وہ ریلوے اسٹیشن پہنچ گئے۔ لڑم کو رات کی گاڑی کا وقت معلوم تھا۔

اس نے لڑکی کو اُس طرف کھڑا کیا جہاں انجن رکتا تھا۔ وہ لڑکی سے پیسے لے کر ٹکٹ لینے گیا۔ اس نے انبار کے دو ٹکٹ لیے۔ اتنے میں گاڑی آگئی۔ یہ چھوٹا سا اسٹیشن تھا۔ گاڑی رُکی اور چل پڑی۔ وہ دوڑتا لڑکی کے پاس پہنچ چکا تھا۔ اُسے بازو سے پکڑ کر دوڑایا۔ لڑکی نے ایک ڈبے کا ڈنڈا پکڑ لیا۔ گاڑی چلی جا رہی تھی۔ لڑم اُس کے پیچھے ساتھ لگا کھڑا تھا۔ پانیہ ان

گھر جا کر اُس نے یہ زخم صرف لڑکی کو دکھاتے، اور اُسے بتا دیا کہ اُس کے منگیتر کو وہ ختم کر آیا ہے۔ لڑکی پہلے تو گھبراتی پھر سنبھل گئی اور بولی۔ ”یہ تم نے مجھ پر احسان کیا ہے.... اب دوسرا احسان کرو چلو یہاں سے بھاگ چلیں“

لڑم نے انکار کر دیا اور کہا کہ وہ اب اکیلا جاتے گا اور ہمیشہ کے لئے چلا جاتے گا۔ لڑکی نے اپنی محبت کا واسطہ دیا۔ لڑم پر کچھ اثر ہونے لگا۔ جب وہ اپنے آپ میں آیا تو اسے خیال آیا کہ وہ قاتل ہے اور پکڑا جاسکتا ہے۔ اس نے اپنے بچاؤ کی ترکیبیں سوچنی شروع کر دیں۔ لڑکی نے بھی اس کی مدد کی۔ لڑم نے اپنا زخم چھپاتے رکھا۔ لڑکی نے اسے کوئی ویسی دوائی اور مرہم دی۔ پھر پولیس کی تفتیش شروع ہو گئی لیکن میں لڑم کے گاؤں نہیں گیا تھا کیونکہ ایسی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ میری تفتیش کے دوران لڑم اور لڑکی نے گھر سے بھاگ جانے کا فیصلہ کر لیا۔ لڑکی نے اسے کہا تھا کہ یہ منگیتر مر گیا تو برادری میں منگیتروں کی کمی نہیں۔ اُس کی شادی کسی صورت میں لڑم کے ساتھ نہیں ہو سکتی تھی۔ انہوں نے فوراً بھاگ جانا اس لئے مناسب نہ سمجھا کہ ان پر قتل کا شبہ ہوگا اور پولیس ان کا پیچھا کرے گی اور دوسری وجہ یہ بھی کہ لڑم کا پاؤں ابھی ٹھیک نہیں تھا۔

لڑکی اسیر ماں باپ کی اکلوتی اور لاڈلی بیٹی تھی۔ اُس کے لیے بھاگتے وقت رقم ساتھ لے جانا کوئی مشکل مسئلہ نہیں تھا۔

پیر پاؤں رکھو۔ اُس نے ابھی پاؤں رکھا ہی تھا اور دوسرا پاؤں ابھی پلیٹ فارم پر تھا کہ پلیٹ فارم ختم ہو گیا۔ لڑکی لٹک گئی پھر گھوم کر ایسی گری کہ گاڑی کے نیچے آ گئی۔

مُزم بھی گرا لیکن گاڑی سے دُور رہا۔ اُسے لڑکی کی بیچ سناٹی دی دوڑ کر دیکھا۔ لڑکی کی ٹانگیں الگ، بازو الگ اور دھڑ بالکل بے حس الگ پڑا تھا۔ گاڑی رُک گئی۔ پلیٹ فارم کی طرف سے تین چار آدمی دُور سے آ رہے تھے۔ مُزم وہاں سے کھسک گیا اور باندھیرے میں غائب ہو گیا۔ ”میں اس لڑکی کی خاطر گاؤں میں رہا ورنہ بہت عرصہ پہلے بھاگ جاتا۔ اس نے چمکیاں لے لے کے روتے ہوئے کہا۔“ اسی کی خاطر قتل کیا تھا۔ وہ نہ ہی تو میں وہاں رُک کر کیا کرتا۔ میرا داغ جواب دے گیا۔ میں روتا ہوا اُس سمت کو چل پڑا جہرے سے مجھے پولیس پکڑ کر لاتی ہے۔ اگر میرا داغ ٹھکانے رہتا تو میرے پاس انبالہ کا ٹکٹ تھا۔ میں آگے جا کر اسی گاڑی میں سوار ہو جاتا۔ گاڑی رُک کر کھڑی تھی، مگر میری ہچکی بندھی ہوتی اور ہوش اُڑے ہوئے تھے۔ میں دس سال پہلے کوئٹہ کے پلے سے نکل کر اور اپنے سارے کپڑے کی لاشیں دیکھ کر اسی طرح رویا تھا جس طرح اس لڑکی کی موت پر رویا۔ میں ویرانوں میں روتا پھرا اور یہ ہوش نہیں بچتی کہ میں کہاں ہوں اور کدھر جا رہا ہوں....

”مجھے یہ بھی یاد نہیں کہ لڑکی کے مرنے کے بعد یہ دوسرا دن تھا یا تیسرا کہ مجھے ریلوے لائن نظر آتی۔ پہاڑیوں میں سے سیاہ دھواں اُٹھتا

نظر آیا اور انجن کی دُسل بھی سناٹی دی۔ گاڑی آ رہی تھی۔ مجھے یک لخت سکون محسوس ہونے لگا۔ میں نہایت اطمینان سے ریلوے لائن پر گردن رکھ کر پیٹ کے بل لیٹ گیا اور مجھے وہ لڑکی نظر آنے لگی جو میری محبت پر مری تھی۔ انجن نے دُسلیں دیں لیکن میں نہ اُٹھا۔ میرے دل میں خوف یا افسوس بالکل نہیں تھا۔ میری یہی ایک خواہش تھی کہ مر جاؤں اور میری خواہش پوری ہونے میں ایک دو منٹ رہ گئے تھے مگر ایک آدمی نے مجھے اُٹھا لیا۔ تب میں نے دیکھا کہ گاڑی میرے قریب رُک کر کھڑی ہے۔ میں نے بھاگنے کی کوشش کی مگر انہوں نے مجھے پکڑ لیا۔ مجھے پکڑے جانے کا افسوس نہیں، افسوس یہ ہے کہ مرنے کی خواہش پوری نہ ہوئی۔“ قتل کا اقبال کرنے کے باوجود اُس کے مرنے کی خواہش پوری نہ ہوئی۔ اُسے عمر قید دی گئی تھی۔



## نقمان حکیم کا نسخہ

لاش کی اطلاع مجھے اُس وقت ملی جب صبح ابھی نیم، ریک تھی۔ مجھے میری بیوی نے جگا کر بتایا تھا کہ کانٹیل کہہ گیا ہے کہ ایک ٹھاکر پٹ درج کرانے آیا ہے اس کے باغیچے میں ایک عورت کی لاش پڑی ہے جس کا سر کلہاڑی یا ٹوکے سے کٹا ہوا ہے۔

مجھے اُس وقت کا ایک ایک لمحہ، ایک ایک بات اور ایک ایک حرکت اچھی طرح یاد ہے۔ نئی نئی شادی ہوئی تھی۔ گھر میں ابھی کوئی مسئلہ کھڑا نہیں ہوا تھا۔ گھر میں جو وقت گزرتا ہنستے کھیلنے اور ایک دوسرے کے ساتھ مذاق کرتے گزرتا تھا۔ مجھے یاد ہے کہ بیوی جب مجھے کانٹیل کا پیغام دے رہی تھی میں نیم بیداری کی حالت میں تھا۔ رات بہت دیر تک تھانے میں کام کرتا رہا اس لئے کانٹیل نے دروازہ کھٹکھٹایا تو میری آنکھ نہ کھلی۔ بیوی جاگ اٹھی اور جا کر کانٹیل سے رپورٹ لے لی۔ اُس نے مجھے جگایا اور رپورٹ مجھے دی جو میں نے نیم بیداری کی حالت میں

سنی۔ اسی حالت میں مجھے اپنی بیوی کا منہ نہ سنانی دیا اور میں پورے طرح بیدار ہو گیا۔ میری بیوی میرے پانگ پر بلکہ مجھ پر لوٹ لوٹ ہوتی جا رہی تھی۔

میں ٹھاکر کی رپٹ اور عورت کی لاش کو مذاق سمجھا۔ بیوی نے مجھے جگانے کے لئے جھوٹ بولا تھا۔ میں ابھی جاگنے کے موڈ میں نہیں تھا۔ میں نے اسے کہا کہ تم گھر میں نکلتی رہتی ہو اور میں بیس گھنٹے کام کرتا ہوں۔ مجھے ذرا سونے دو لیکن اس نے مجھے جھنجھوڑ کر کہا۔ ”چاہے دوپہر تک سوتے رہیں، مجھ سے یہ تو سن لیں کہ میں ہنس کیوں رہی ہوں۔“ میں نے پوچھا تو اس نے کہا۔ ”آپ کی جاگ پوری طرح نہیں نکلتی تھی جب میں آپ کو بتا رہی تھی کہ ٹھاکر کے باغیچے میں ایک عورت کی لاش پڑی ہے۔ آپ نے خواب میں بڑبڑانے کے لمحے میں پوچھا۔ لاش زندہ ہے یا مر گئی ہے؟۔ میری ہنسی چھوٹ گئی۔“

تو یہ مذاق نہیں تھا۔ میں نے پھر بھی بیوی سے پوچھا۔ ”جھوٹ بک رہی ہو یا واقعی کا ٹیبل آیا تھا؟“

کا ٹیبل واقعی آیا تھا۔ میں تھانیدار تھا۔ قصبے میں تھانیدار بادشاہ ہوتا ہے۔ جب جی چاہے جاگے۔ ڈیوٹی پر جاتے نہ جاتے۔ میں رات ایک بجے سو اٹھا۔ دن کے ایک بجے تک سونے سے مجھے کوئی نہیں روک سکتا تھا لیکن میں اچھل کر بستر سے نکلا۔ اس فرض شناسی کی ایک وجہ یہ تھی کہ انگریزوں کی حکومت تھی جو کوتاہی اور سہل انگاری کی سزا دیتی تھی۔ دوسری

وجہ یہ کہ اس واردات کی نفی میں مجھے ہی کرنی تھی۔ فوراً کرتا یا دیر سے کرتا تاخیر نقصان دہ ثابت ہو سکتی تھی۔ جاتے واردات پر فوراً پہنچنے سے نفی آسان ہو جاتی ہے، ورنہ تماشائی کھڑا کھوج مٹا دیتے ہیں۔ تیسری وجہ یہ تھی کہ ٹھاکر خود در پورٹ دینے آیا تھا اور لاش اس کے باغیچے میں پڑی تھی۔ ناقابل وہ خود ہو سکتا تھا۔ ٹھاکر ہندو زمیندار تھے۔ نوکروں، مزارعوں اور بچوں ذاتوں کے لئے فرعون ہوتے تھے۔ وہ ہمارے سندھی وڈیروا سے ملتے جلتے تھے۔

صبح کی اذان سناتی دے رہی تھی۔ میں نے جلدی جلدی غسل کر نماز پڑھی۔ بیوی ناشتہ تیار کر چکی تھی۔ میں نے ناشتہ کیا اور چل پڑا۔ دروازے سے نکلا تو مجھے بیوی کی آواز سنائی دی۔ ”الٹ کرے لاش زندہ ہو۔“

محنت اور مشقت کرنے والے خاوند کے لئے اچھی اور خوش طبع بیوی ایک ٹانگہ ہوتی ہے۔ میں اپنی بیوی کی شگفتگی سے تروتازہ ہو کر تھانے پہنچا۔ نیند پوری نہ ہونے کے باوجود طبیعت میں تازگی آگئی۔ تھانے میں ٹھاکر میرے دفتر میں بیٹھا تھا۔ اس ہندو زمیندار کی عمر پچاس سال کے لگ بھگ تھی۔ آدھا چہرہ مونچھوں نے چھپا رکھا تھا۔ چہرے سے فرعونیت ٹپک رہی تھی۔ اس کا اتنی سویرے در پورٹ دینے آنا مشکوک سا فعل تھا۔ یہ لوگ رات شراب میں بدمست ہو جاتے اور دوپہر تک سونے کے عادی تھے۔

ذہن میں رکھا کہ مرنے والی ٹھاکر کے نوکر دوں چاکر دوں کی عورت تھی۔  
 ان فرعونوں کی نگاہ میں نوکر دوں اور مزارعوں کی بہو بیٹیوں کی تو  
 کوئی عزت ہی نہیں تھی۔ ان مظلوموں کو وہ کھانے کے لئے اتنا ہی دیتے  
 تھے جس سے وہ صرف زندہ رہتے تھے۔ انہیں اپنا محتاج بناتے رکھتے  
 تھے۔ ان کی شاذلیوں پر انہیں قرض دیتے اور اس احسان کے بدلے وہ ان  
 کو اپنی دہن سمھتے تھے۔ انسانوں کی سہا تے وہ مولیٹیوں کی قدر کرتے  
 تھے کیونکہ مولیٹی قیمتا ملے تھے اور انسان مفت ہاتھ آجاتے تھے۔ ان  
 آدمیوں نے انسانوں میں کسی کو جان سے مار دینا ان ٹھاکروں کے لئے  
 کوئی مذموم فعل نہیں تھا۔ مرنے والے کے لواحقین پولیس کو اطلاع دینے  
 کی جرات نہیں کرتے تھے۔ مجھے یہ سوال پریشان کر لے لگا کہ اپنے نوکر دوں  
 چاکر دوں کی عورت کی لاش کو اس ٹھاکر نے اُس کے لواحقین کے حوالے  
 کر کے جلا دینے کا حکم کیوں نہ دیا؟ رپٹ درج کرانے کیوں آگیا؟  
 میں نے اُس سے کوئی فالتوبات نہ کی۔ بڑا ہی تجربہ کار کھوجی شہر  
 سے ایک میل دور گاؤں میں رہتا تھا۔ ٹھاکر کی گھوڑی ایک کانٹیل کو  
 دے کر کہا کہ کھوجی کو جتنی جلدی ہو سکے ٹھاکر کے باغیچے میں لے آئے۔  
 میں اپنے ہیڈ کانٹیل اور دو کانٹیلوں کو ساتھ لے کر ٹھاکر کے  
 ساتھ پیدل جاتے واردات کی طرف چل پڑا۔ راستے میں ٹھاکر مقتولہ  
 کے متعلق ایسی باتیں کرتا گیا جن میں ہمدردی یا افسوس کی بجائے نفرت  
 اور حقارت تھی۔ اُس کے یہ الفاظ مجھے یاد ہیں۔ اُس نے گالی دے کر کہا۔

”ٹھاکر جی کس کی لاش دیکھ آتے سویرے سویرے؟“  
 ”میرے نوکر دوں چاکر دوں کی عورت تھی۔“ اُس نے جواب دیا۔  
 ”باغیچے میں میرا بیٹا ہوتا ہے۔ اپنا ایک مزارعہ کام سے لگا تو کھیت میں  
 اُسے لاش پڑی نظر آتی۔ اُس نے میرے بیٹے کو جگا کر بتایا۔ بیٹے نے  
 مجھے آکر بتایا۔ میں شہر میں رہتا ہوں۔ بیٹے کو میں نے باغیچے میں واپس  
 بھیج دیا اور خود آپ کو رپٹ دینے آگیا۔“

میں نے اُس سے وہی چند ایک رسمی سی باتیں پوچھیں جو اس قسم  
 کی رپورٹ درج کرنے سے پہلے پوچھی جاتی ہیں۔ اُس پر کسی شک کا  
 اظہار نہ کیا۔ اُسے بولنے کا پورا موقع دیا۔ اپنے ذہن میں جو سوال محفوظ رکھے  
 ان میں ایک یہ تھا کہ ٹھاکر کا مزارعہ اتنی سویرے کام کو گیا، وہ کام کیا تھا؟  
 کیا اُس نے اندھیرے میں لاش دیکھ لی تھی؟ ٹھاکر کا بیٹا باغیچے میں ایک مکان  
 میں رہتا ہے۔ اُس نے شہر آکر بوڑھے باپ کو جگایا اور تھانے بھیجا،  
 خود کیوں نہ آیا؟ باپ نے اُسے واپس کیوں بھیج دیا؟ مجھے رپورٹ صبح کی  
 اذان کے ساتھ ملی۔ باغیچہ شہر سے تقریباً پون میل دور تھا۔ لاش دیکھنے والے  
 نے ٹھاکر کے بیٹے کو جگایا۔ بیٹے نے جاکر لاش دیکھی۔ شہر آیا۔ باپ کو جگایا۔  
 باپ بیٹے نے اس کے متعلق باتیں کی ہوں گی۔ پھر باپ تھانے آیا۔ اس  
 سارے عمل میں دو نہیں تو ڈیڑھ گھنٹہ صرف ہوا ہوگا۔ میرے حساب کے  
 مطابق لاش نصف شب سے کچھ دیر بعد دیکھی گئی یا باپ بیٹے نے یا بیٹے  
 نے مقتولہ کو نصف شب سے کچھ دیر بعد قتل کیا۔ یہ تو میں نے خاص طور پر



مقتولہ کے متعلق کچھ معلوم کرنے کے لئے کہا۔ ”یہ لوگ کالے مکھڑے سے ہوتے ہیں۔ ان کی بیویاں بھی ایسی ہی ہوتی ہیں۔ یہ بھی ایسی ہی ہوگی۔ کالی سی اور بد صورت سی“

”ارے نہیں داروغہ جی! اُس نے کہا۔“ یہ مجھے اپنے باپ کی تو لگتی ہی نہیں تھی۔ اُس کا رنگ سالو لانا نہیں گندمی تھا اور اُس کی صورت اور جسم الیکا اچھے کپڑے پہناؤ تو کوئی نہ کہے کہ یہ کسی مزارعے کی جو روپے عمر بیکس اوتنیس کے درمیان تھی صحت ایسی کہ جوانی چھٹی جاتی تھی“ اُس نے مرنے والی کے حُسن و جوانی کا نقشہ ایسے الفاظ اور ایسے لہجے میں کش کیا جس سے صاف پتہ چلتا تھا کہ مرنے والی پر اُس کی نظر کم تھی۔

”آپ کا بیٹا باغیچے میں ہی رہتا ہے؟“  
”وہیں رہتا ہے“ اُس نے جواب دیا۔ ”بڑا اچھا مکان ہے“  
”اُس کی عمر کتنی ہوگی؟“

”اس سال چھیس برس کا ہو جائے گا۔“

”اکیلا رہتا ہے؟“

”اُس کی بیوی اُس کے ساتھ رہتی ہے۔“

لاش تھی خُون نہیں تھا

ہم جب جاتے واردات پر پہنچے تو صبح سپید ہو چکی تھی۔ لاش

”ان لوگوں کی عزت اور آبرو تو کوئی ہوتی نہیں۔ رات چرس اور مٹھڑہ پنی کر ایک دوسرے کی عورتوں کے ساتھ کھلتے ہیں۔ کبھی لڑبھی پڑتے ہیں۔ یہ عورت جس کی لاش ہمارے باغیچے میں پڑی ہے بدعاش تھی۔ اس کا خاوند دے کامریض ہے۔ اُس بد سخت کو اپنی ہوش نہیں ہوتی۔ دو قدم چلتا ہے تو سینے پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ جاتا ہے۔ اُس کی بیوی عیش کرتی پھرتی ہے۔ کسی کو اُس نے دھوکہ دیا ہو گا۔ اُس نے کھاڑی مار کر سر کھول دیا میرا کھیت بھر شٹ (ناپاک) کر دیا۔“

”آپ کو یقین ہے وہ بدکار اور عیاش تھی؟“ میں نے پوچھا۔  
”غریب مزارعے کا اخلاق ہوتا ہی کہاں ہے داروغہ جی؟“ اُس نے کہا۔ ”میں تو اس کے مرنے کی رپٹ بھی درج نہ کرتا۔ میرا بیٹا کہنے لگا کہ پولیس کو اطلاع کر دو کہیں البانہ ہو کہ یہ خون کوئی دشمن ہمارے کھاتے میں لکھوادے۔ آپ چل کر دیکھ لیں۔ لاش اُس کے خاوند کے حوالے کر دیں۔ میں آپ کو اس سے زیادہ پریشان نہیں کروں گا۔ آپ کے پاس اتنا وقت کہاں ہوتا ہے جو ان لمپھوں کے جینے مرنے پر ضائع کرتے پھر س؟“

”ہاں تھا کہ جی! میں نے کہا۔“ لمپھوں کی ایک بدکار عورت ماری گئی تو کیا فرق پڑتا ہے؟“

وہ خوش ہو گیا۔ میں نے اُس کے سینے سے اصل بات نکالنے کے لئے دوستانہ باتیں شروع کر دیں۔ تفتیشی جرح کے انداز سے کچھ نہ پوچھا۔

بینگوں کے کپڑوں میں پڑی تھی۔ باغیچہ بہت بڑا تھا۔ یہ دراصل سبزلیوں کا باغ تھا۔ اس کے ارد گرد ٹھاکر کے کھیت تھے۔ باغیچے کے وسط میں ایک مکان تھا جس میں ٹھاکر کا بیٹا رہتا تھا۔ باغیچے سے ملحق مٹی کی دیواروں اور گھاس بھونس کی چیتوں والے چھ سات تھوڑے تھے جن میں ٹھاکر کے نوکر چاکر اور مزارے کنبوں سمیت رہتے تھے۔ جہاں لاش پڑی تھی وہاں سے یہ تھوڑے تقریباً ڈیڑھ سو گز دور تھے۔

لاش ٹیڑھی سی پڑی تھی۔ اُس علاقے کے مطابق مقتولہ نے گہرے رنگ اور موٹے کپڑے کا گھراہن رکھا تھا۔ گلے میں جہیر کی طرح چھوٹی سی تینیس تھی۔ اس لباس کے ساتھ عورتیں موٹے کپڑے کا دوپٹہ لیتی تھیں۔ لاش کے ساتھ دوپٹہ نہیں تھا۔ ایک پاؤں میں جوتی نہیں تھی۔ اُس علاقے کے مزدور لوگ اور مزارے ننکے پاؤں کام کیا کرتے تھے۔ ادھر ادھر آتے جاتے ویسی جوتی پہنتے تھے۔ لاش کے بازوؤں میں چوڑیاں تھیں۔ ان میں پلاسٹک کی بھی تھیں اور کانچ کی بھی۔ نظری معائنے سے پتہ چلا کہ سر میں دوزخم ہیں۔ یہ کھانڈی کے تھے یا ٹوکے کے۔ کھوپڑی کھل گئی تھی۔ دونوں وارانتے گہرے تھے اور ایسے لگے تھے کہ مغز بھی زد میں آیا تھا۔ مغز دکھائی دے رہا تھا۔ جسم پر کوئی اور زخم نہیں تھا۔ یہ پوسٹ مارٹم سے معلوم کرنا تھا کہ قتل سے پہلے مقتولہ کے ساتھ کیا سلوک ہوا ہے۔ لاش کا رنگ تمام خون نکل

جانے سے سپید ہو گیا تھا۔ مقتولہ کی عمر تیس سال سے خاصی کم لگتی تھی۔ چہرے پر درد کے آخری تاثرات تھے۔ موت نے درد کا یہ تاثر چہرے پر منتقل کر دیا تھا۔

لاش کے دیگر کوائف یہ تھے کہ ہاتھوں اور بازوؤں پر مٹی تھی۔ کپڑوں پر بھی مٹی تھی جو ظاہر کرتی تھی کہ مقتولہ کچی مٹی پر تر پڑی رہی ہے۔ مزید گہرے معائنے سے نظر آیا کہ لاش کے ناخنوں میں بھی مٹی چھپی ہوئی تھی۔

میں نے لاش کی جوتی اتار کر رکھ لی۔ دوسرے پاؤں کی جوتی غائب تھی چوڑیوں کے متعلق مجھے ایک تجربہ ہو چکا تھا۔ میرے استاد نے بھی مجھے بتایا تھا کہ عورت کی چوڑیاں نہایت کالہ آمد چیز ہے اور بہترین کھوج۔ پلاسٹک کی چوڑیاں نہیں لوثتیں، کانچ کی چوڑیاں دھنکامشتی میں لوث جاتی ہیں۔ بعض اوقات چوڑی کا ایک ٹکڑا سارا معتمل کر دیا کرتا ہے۔ میں نے کانچ کی تین چوڑیاں اُس کے بازو سے توڑ کر اپنے پاس رکھ لیں۔ یہ تین مختلف رنگ تھے۔

جانتے واردات پر میں نے خصوصیت یہ دیکھی کہ وہاں خون کا ایک قطرہ بھی نہیں تھا۔ لاش کے زخموں کے ارد گرد چہرے پر کپڑوں اور بالوں پر خون جم کر خشک ہو گیا تھا۔ بینگوں کے پودوں پر (جن پر لاش پڑی تھی) کوئی خون نہیں تھا۔ اس سے ظاہر ہوتا تھا کہ اسے کہیں اور قتل کیا گیا ہے اور لاش یہاں پھینکی گئی ہے۔ کسی نے اسے

فصل والا کھیت تھا۔ مجھے یاد نہیں رہا کہ فصل کیا تھی۔ درمیان میں مینڈھ تھی۔ مینڈھ اتنی سخت اور بچی تھی کہ کوئی کھرا نظر نہیں آتا تھا۔ اگر کوئی تھا بھی تو وہ تماشا تیلوں نے مٹا دیا تھا۔ کیا رے میں اور مینڈھ کے کنارے جو کھڑے ملے اُن میں ایک ٹھاکر کے بیٹے کا تھا، دوسرا اُس آدمی کا جس نے لاش دیکھی تھی اور ان میں ایک کھرا الگ تھلک تھا۔ جو تو شہری معلوم ہوتی تھی۔ کھڑوں کے متعلق میں آپ کو کئی بار بتا چکا ہوں کہ ہر کوئی کھرا نہیں پہچان سکتا۔ تجربہ کار پولیس افسر بھی بعض کھڑے نہیں پہچان سکتے۔ ”کھرا اٹھانا“ ایک سائنس ہے۔ پاکستان میں ساہی وال کے دیہاتی علاقے کے اور بہاولپور کے صحرائی علاقے کے کھوجی اس سائنس کے ماہر ہیں۔ یہ لوگ جانگلی اور پسماندہ ہونے کی وجہ سے اہمیت حاصل نہیں کر سکے۔ میں وٹوٹی سے کہہ سکتا ہوں کہ اس فن میں برطانیہ کا سکاٹ لینڈ یارڈ اور امریکہ کا فٹیشی ادارہ ایف۔ بی۔ آئی ہمارے جانگلی کھوجیوں کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ اب تو ان کھوجیوں کی اہمیت اور ضرورت اس وجہ سے بھی ختم ہو گئی ہے کہ پولیس کے ہاں سرانجامی کاروبار نہیں رہا۔ مستقبلہ افراد کو تھانے لگا کر تشدد میں ڈال دیا جاتا ہے۔ مخبروں کا سہارا لیا جاتا ہے اور کوشش کی جاتی ہے کہ ان میں سے کوئی اقبال جرم کر کے مجسٹریٹ کے سامنے دفعہ ۱۴۴ کے تحت اقبالی بیان قلم بند کرادے۔ سلطانی گواہ بھی بناتے جاتے ہیں۔ اس طریقہ کار کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ عدالت میں ملزم بھی اور سلطانی گواہ

اپنے گھر میں قتل کیا ہوگا۔ یعنی موقعہ واردات کہیں دُور تھا۔ اس سے مجھے نفیثہ پیچیدہ ہوتی نظر آتی۔ عموماً یہ ہوتا تھا کہ کسی کو قتل کر کے لاش رات کو ریلوے لائن پر پھینک دی جاتی تھی۔ تیز رفتار ریل گاڑی لاش کے ٹکڑے کرتی گزرجاتی تھی۔ خون کی غیر موجودگی سے یہ پتہ چل جاتا تھا کہ قتل کہیں اور کیا گیا ہے۔ اس واردات میں لاش ٹھاکر کے باغیچے میں پھینکی گئی۔ دو ہفتے سے تیس ہفتے تھیں۔ ایک یہ کہ قاتل ٹھاکر یا اس کا بیٹا ہے اور قاتل ان کے گھر میں ہوا ہے۔ دوسرے یہ کہ قاتل کسی اور نے کیا اور ٹھاکر کو مصیبت میں ڈالنے کے لئے لاش اس کے باغیچے میں پھینک دی۔ قاتل مزارعوں اور نوکر دوں چاکروں میں سے بھی کوئی ہو سکتا تھا۔ یہ بھی دیکھنا پڑتا ہے کہ قاتل کا طریقہ کیا اختیار کیا گیا ہے۔ گلا گھونٹ کر مارنے سے کوئی اور کہانی سامنے آتی ہے۔ زہر دینے کا پس منظر کچھ اور ہوتا ہے۔ کلبھاڑی، ٹو کے اور چاقو کا استعمال کچھ اور معنی رکھتا ہے اس واردات میں کلبھاڑی استعمال کی گئی تھی۔ میں نے زخم غور سے دیکھے۔ وار پیچھے سے کتے کتے تھے۔ سامنے سے یادائیں باتیں سے کہتے جاتے تو زخموں کے زاویے کچھ اور ہوتے۔ مجھے اس پر بھی غور کرنا تھا کہ وار پیچھے سے کیوں کہتے گئے۔

اس واردات میں کھڑوں (پاؤں کے نشان) کی شدید ضرورت تھی کیونکہ لاش کہیں اور سے لائی گئی تھی۔ مجھے موقعہ واردات تک پہنچنا تھا۔ جیسا کہ بتا چکا ہوں کہ یہ بیگانوں کے کیا رے تھے۔ اس کے ساتھ

بھی مخرف ہو جاتے ہیں اور کہیں چوہٹ ہو جاتا ہے۔

## خاوند مرلیض بیوی حسین

میں نے جس کھوجی کو بلایا تھا وہ آگیا۔ اُس نے لاش کے ارد گرد زمین دیکھی۔ بیگنوں کے پودوں کے ٹوٹے ہوئے پتے دیکھے۔ مینڈھ کا کنارہ دیکھا۔ اُس نے تین چار پتے توڑ لئے یا ٹوٹے ہوئے پتے اٹھائے۔ بیگن کا پتہ چوڑا اور لمبا ہوتا ہے۔ ان پتوں پر مٹی کے کچھ نشان تھے۔ کھوجی نے مینڈھ کے کنارے پر ایک کھڑا مجھے دکھایا اور کہا ”یہ ہے آپ کا لڑم“۔ اُس نے مینڈھ کے کنارے کے دو اور کھڑے مجھے دکھا کر کہا ”اس پر لاش کا وزن ہے۔ یہ دیکھیں۔ لاش پھینک کر جا رہا ہے۔ اس پر کوئی وزن نہیں“

میں ابھی اتنا زیادہ تجربہ کار نہیں ہوا تھا۔ مجھے دونوں کھڑوں میں کوئی فرق نظر نہ آیا کیونکہ میری آنکھ کھوجی کی آنکھ نہیں تھی۔ اُس نے پتے دکھا کر کہا ”یہ بھی آپ کا لڑم ہے۔ آپ چاہیں تو زمین والے کھڑے کا مولدہ بنوائیں۔ میں اس کی ضرورت نہیں سمجھتا۔ کھڑا صاف ہے۔ سوئیل دُور دس سال بعد بھی پہچان لُوں گا“

”پھر اٹھاؤ کھڑا“ میں نے کہا۔ کھڑا اٹھانے کا مطلب یہ ہے کہ زمین دیکھتے دیکھتے ہی کھڑا تلاش کرو اور موقعہ وار دات تک پہنچو۔

میری اصل کام تھا۔

کھوجی زمین سے بھید لینے میں مصروف ہو گیا۔ میں نے اپنی کاغذی اور دیگر کارروائی شروع کر دی۔ لاش پوسٹ مارٹم کے لئے بھجوا دی۔ یہ ایک بڑا قصبہ تھا جس میں سرکاری ہسپتال اور ایک ڈاکٹر تھا۔ عام قسم کا پوسٹ مارٹم وہیں ہو جاتا تھا، دیگر ٹیسٹوں کے لئے دُور جانا پڑتا تھا۔ میرے قصبے کا ڈاکٹر ہندو تھا اور صبح معنوں میں ڈاکٹر۔ ذرہ بھر متعصب نہیں تھا۔

میں نے ایک آدمی کو اس پیغام کے ساتھ تھانے کو دوڑا دیا کہ چار کانٹیلوں کو فوراً بلالائے۔ ہیڈ کانسٹیبل میرے ساتھ تھا۔ اُسے کہا کہ باغیچے کے جس مکان میں ٹھاکر کا بیٹا رہتا ہے اُس کے دروازے پر جا کر کھڑا ہو جاتے۔ کسی کو اندر نہ جانے دے یا باہر نہ آنے دے۔ دو کانٹیل میرے ساتھ تھے۔ انہیں کہا کہ مزارعوں کے جھونپڑوں میں جا کر ہر کسی کو باہر نکال دیں اور وہاں کھڑے رہیں۔ میں نے ایک مرلی سے آدمی کو دیکھا۔ کچھ دُور بیٹھا رو رہا تھا۔ اُس کا دم اُکھڑا ہوا تھا۔ سانس بڑی ہی مشکل سے لے رہا تھا۔ وہ مقتولہ کا خاوند تھا۔ اُسے اپنے پاس بلایا۔ آہستہ آہستہ چلتا آیا۔ اُس کی حالت بہت ہی بُری تھی۔ میں نے اپنے بیٹھنے کا انتظام باغیچے کے اندر کر لیا۔ مقتولہ کے خاوند کو وہاں لے گیا اور اُسے پاس بیٹھا کر تسلی دلا دیا۔

”کچھ بتا سکتے ہو تمہاری بیوی کو کس نے قتل کیا ہے؟“ میں نے اُس سے پوچھا۔

”کچھ نہیں حضور! اُس نے روتے ہوئے جواب دیا۔ دمر اُسے بولنے نہیں دے رہا تھا۔ ”میرا تو کئی دشمن نہیں مرنے والی کی کسی کے ساتھ دشمنی تھی تو مجھے معلوم نہیں!“

میں اس آدمی کو اس نظر سے دیکھ رہا تھا کہ ٹھاکر کے کہنے کے مطابق مقتولہ خوبصورت اور جوان تھی اور اُس کا چال چلن بھی ٹھیک نہیں تھا۔ اُس کے خاوند کو اس بُری حالت میں دیکھ کر مجھے یقین ساہونے لگا کہ اس غلام مرض کے مریض کی بیوی کا چال چلن خراب ہو گا۔ لہذا یہ شک بھی بے جا نہ تھا کہ خاوند نے بیوی کو قتل کر دیا ہے۔ میں یہ دیکھ رہا تھا کہ اس آدمی کے بازوؤں اور جسم میں اتنی جان ہے یا نہیں کہ کھاڑی کا اتنا سخت وار کر سکے کہ کھوڑی کھول دے۔ یہ پیش نظر رکھیں کہ انسانی کھوڑی بڑی ہی سخت ہوتی ہے۔ کھاڑی کھوڑی توڑ سکتی ہے لیکن جتنے گہرے وار مقتولہ کی کھوڑی پر کتے گتے تھے وہ اس مرل آدمی کے نہیں ہو سکتے تھے۔ کھاڑی مغز تک اتر گئی تھی۔ میں آپ کو یہ بھی بتا دوں کہ کھوڑی میں اتنی گہری اُتری ہوئی کھاڑی نکالنے کے لئے اس سے زیادہ طاقت کی ضرورت ہوتی ہے جس طاقت سے وار کیا جاتا ہے۔ یہ خاوند تو کھاڑی کا بوجھ اٹھانے کے بھی قابل نہیں تھا۔ اس کے باوجود میں نے اسے شک میں رکھا کیونکہ یہ ممکن ہو سکتا تھا کہ اس نے اپنے کسی دوست سے یا کسی کو اُجرت دے کر بیوی کو قتل کرایا ہو۔

”دسے کامرمن کب سے شروع ہوا ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”شادی کے دوسرے سال“ اُس نے جواب دیا۔ ”اُس نے جواب دیا۔“ اس سے پہلے تو میں بالکل ٹھیک تھا۔ چھ سال ہو گئے ہیں علاج کراتے۔“

”کیا تم یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہو کہ اس حالت میں بھی بیوی تمہاری دغا دار تھی؟“

”جی حضور! اُس نے جواب دیا۔“ میں سولہ آنے یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ اُس نے مجھے دھوکہ نہیں دیا۔۔۔ ہم بہت دُور کے رہنے والے ہیں نہ اس کے ماں باپ کو معلوم ہے کہ ہم کہاں ہیں نہ میرے ماں باپ کو معلوم ہے۔ یہ میرے ساتھ گھر سے بھاگی تھی۔ ماں باپ اس کی شادی جس کے ساتھ کر رہے تھے وہ آسودہ حال گھر کا لڑکا تھا لیکن اس کا دل میرے ساتھ تھا۔ آپ نے محبت کے بہت قصے سنے ہوں گے ہماری محبت جیسا قصہ کوئی نہیں سنا ہو گا۔“

میں اُس کی محبت کا قصہ سُنانے کے مُوڑ میں نہیں تھا لیکن میں اُس کے جذبات کو مجروح بھی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ وہ جذباتی انداز سے بول رہا تھا۔ اپنے وقت کو یاد کر رہا تھا۔ اُسے یہ بھی احساس نہیں رہا تھا کہ وہ ایک تھانیدار کے ساتھ باتیں کر رہا ہے جس کے دل میں اُس کے خلاف قتل کا شبہ ہے۔ وہ مجھے یقین دلا رہا تھا کہ اُس کی بیوی نے بیماری میں اُس کا ساتھ نہیں چھوڑا اور اُس کا علاج کراتی رہی ہے۔ وہ خود کام کاج کے قابل نہیں رہا تھا۔ مقتولہ باغیچے میں ٹھاکر کے بیٹے کے گھر کام کرتی اور خاوند کا علاج کراتی تھی۔ وہ کسی حکیم سے دوائی لاتی تھی۔

میرے ذہن میں دو باتیں آرہی تھیں۔ ایک یہ کہ اس قسم کے خاوند عموماً بیویوں کے ہاتھوں قتل ہو کر مٹ جاتے ہیں۔ اگر مقتولہ اتنی دلیر تھی کہ اس آدمی کے ساتھ گھر سے بھاگ آتی تھی اور بھاگ کر کی راتوں کی راتوں کے مطابق اب بدکار تھی تو اس کے ہاتھوں اس خاوند کو قتل ہونا چاہیے تھا۔ ایسی بیویاں اس قسم کے خاوندوں کو زہر دے دیا کرتی ہیں۔ لوگ یہی سمجھتے ہیں کہ خاوند بیماری سے مر رہا ہے۔ یہ خاوند تو ذرا سے دھکے کا منتظر تھا، مگر وہ کہہ رہا تھا کہ بیوی اس کا علاج کراتی تھی۔ دوسری بات میرے ذہن میں یہ آتی کہ بیوی اسے اُٹھ پٹا لگا دواتیاں دے کر اس کی آنکھوں میں دھول جھونکتی رہی اور باہر اپنے کھیل کھیلتی رہی ہے۔ میں بال کی کھال اُٹارنے کی کوشش کرنے لگا۔

”وہ کیسی تھی؟“ ہمیں لے پوچھا۔ ”ہوشیار تھی؟ چالاک تھی؟ سیدھی سادی تھی؟“

”ہوشیار تو بہت تھی۔“ اُس نے جواب دیا۔ ”ایسی سیدھی بھی نہیں تھی کہ کسی کے جال میں آجاتی۔“

”میں نے مان لیا کہ تمہیں دوائی لا کے دیتی تھی۔“ میں نے کہا۔ ”ذرا توجہ سے یاد کرو اور مجھے بتاؤ کہ گھر میں خوش رہتی تھی یا تمہاری بیماری کی وجہ سے پریشان اور کچھ بچھی رہتی تھی؟“

”وہ جی ہنسنے کھیلنے والی لڑکی تھی۔“ اُس نے جواب دیا۔ ”خوش رہتی تھی۔ میں اپنی بیماری سے تنگ اگر کبھی کبھی رو پڑتا تھا تو مجھے حوصلہ

دیا کرتی تھی۔ وہ دل گڑ دے والی تھی۔“

”ایک ہی حکیم سے دوائی لاتی رہی ہے؟“

”نہ جی ہاں۔“ اُس نے جواب دیا۔ ”بہت سیانے آزماتے ہیں۔ ڈاکٹر (سرکاری ہسپتال والے) سے بھی دوائی لیتے رہے۔ اب کوئی تین مہینوں سے اس حکیم کا علاج چل رہا ہے۔ بیوی مجھے اُس کے پاس لے گئی تھی۔“

”اس کی دوائی سے آرام نہیں آیا؟“

”پورا آرام تو نہیں آیا۔“ اُس نے جواب دیا۔ ”دوائی کا اثر اچھا ہے۔ اس حکیم پر میرا یقین بیٹھ گیا ہے۔“

خاوند کو افیم کھلا کر چلی گئی

اس کا مطلب یہ تھا کہ بیوی اس کا علاج سنجیدگی سے کر رہی تھی۔ میں اس آدمی کی زبان سے یہ سننا چاہتا تھا کہ دوائی کا کچھ فائدہ نہیں ہوا بلکہ حالت روز بروز بگڑتی جا رہی ہے۔ میں نے بہت سے سوال کر کے اپنا ذہن صاف کر لیا پھر میں سیدھی باتوں پر آگیا۔

”تمہاری بیوی اچھی شکل و صورت والی تھی۔“ میں نے کہا۔ ”سب جانتے تھے کہ تم بیمار ہو اور اپنی بیوی کے لئے مصیبت بنے ہو۔ بعض بد معاش آدمی ایسی بیویوں کی مجبور لڑکیوں سے فائدہ اُٹھاتے ہیں۔“

کیا تمہیں کبھی پتہ چلا تھا کہ ایسا کوئی آدمی تمہاری بیوی پر بری نظر رکھتا ہے اور اُس کے پیچھے پڑا ہوا ہے؟

”ہمارے ہاں کوئی بات چھپی نہیں رہتی۔“ اُس نے جواب دیا۔

”جس کسی کو کسی کے بارے میں کوئی بات سناتی دے وہ اُس تک ضرور پہنچاتی جاتی ہے۔ اگر میری بیوی کے متعلق کوئی ایسی ویسی بات مشہور ہوتی تو میرے کانوں میں ضرور پڑتی۔“ اُس نے آہ بھر کر کہا۔ ”ہم بہت غریب لوگ ہیں حضور! ہماری عزت انہی کے ہاتھوں میں ہے جن کا ہم دیا کھاتے ہیں۔ ہم ان کے بھکاری ہیں۔ ان کے آگے دم نہیں مار سکتے۔ ٹھاکر کا بیٹا اچھا آدمی نہیں۔ میری بیوی نے دو تین بار مجھے بتایا تھا کہ وہ اسے فالٹو پیسے دیتا رہتا ہے اور اس کا دل صاف نہیں۔ میری بیوی نے یہ بھی کہا تھا کہ مجھے تمہارے لئے دوائیوں کی ضرورت ہے اور دوائیوں کے لئے پیسوں کی ضرورت ہے اس لئے میں چھوٹے ٹھاکر کو انگلیوں پر سنا رہی ہوں۔ اگر تمہارے کانوں میں کوئی اُلٹی سیدھی بات پڑے تو اعتبار نہ کرنا۔ میں اتنی جلدی کسی کو عزت دینے والی نہیں۔“

”تم نے اعتبار کر لیا تھا؟“

”اعتبار نہ کرتا تو کسی کا کیا بگاڑ لیتا حضور! اُس نے کہا۔ ”بیواری نے مجھے اس قابل نہیں چھوڑا کہ کسی کے منہ آسکتا یا اپنی بیوی کو اپنی مرضی کر لے سے روک سکتا۔ میں بیوی کا محتاج تھا۔“

”کل رات وہ کس وقت گھر سے نکلی تھی؟“

”میرے سو جانے تک وہ گھر میں تھی۔“ اُس نے جواب دیا۔

”ایک آدمی نے صبح جگایا اور بتایا کہ تمہاری بیوی کی لاش کھیت میں پڑی ہے۔“

”شام کو وہ تمہیں خوش نظر آتی تھی؟“

”روزمرہ کی طرح تھی۔“ اُس نے جواب دیا۔

”اس تکلیف میں تمہیں اتنی گہری نیند آ جاتی ہے کہ صبح تک تمہیں

ہوش ہی نہیں آتی؟“

”کبھی کبھی بیوی مجھے ایک گولی دیا کرتی تھی جس سے ساری رات بے ہوشی کی نیند سو رہتا تھا۔“ اُس نے جواب دیا۔ ”کل شام بھی اُس نے مجھے وہ گولی دی تھی۔“

”یہ گولی کبھی کبھی دیتی تھی؟“ میں نے پوچھا۔ ”ہر رات نہیں دیتی تھی؟“

”نہیں۔“ اُس نے جواب دیا۔ ”کتنی تھی کہ یہ گولی ہر رات نہیں لینی چاہیے۔“

اس سے مجھے شبہ ہوا کہ مقتولہ خاوند کی آنکھوں میں دھول جھونکتی رہی ہے۔ جس رات اُسے باہر نکلنا ہوتا تھا اُس رات اسے نیند کی گولی کھلا دی تھی۔ بعد میں پتہ چلا تھا کہ یہ گولیاں اُسے حکیم نے دی تھیں اور یہ انیم کی گولیاں تھیں۔۔۔۔۔ بہر حال اس آدمی سے میں نے یہ حاصل کیا کہ

”داروغہ حضورؐ بڑے ٹھاکر نے کہا۔“ ایسی تو کوئی ضرورت نہیں تھی۔ آپ اندر چلیں۔ ہمارے مہمان بن کے بیٹھیں لیکن ہمارے مزار عر کی بیوی کے قتل میں ہمارے گھر کی تلاشی؟ اس سے بڑھ کر ادب بے عزتی کیا ہوگی“

”آپ دیکھ رہے ہیں کہ میں مزار عول وغیرہ کے گھروں کی بھی تلاشی لے رہا ہوں۔“ میں نے کہا۔ ”مجھے آپ کے گھر کی بھی تلاشی لینا ہے۔ میں صرف ایک منظر اندر دیکھوں گا۔ سامان نہیں کھولوں گا۔“

”آپ ہمیں ہمارے مزار عول کی قطار میں کھڑا کر رہے ہیں۔“ ٹھاکر نے کہا۔

”ٹھاکر صاحب! میں نے اُس کے قریب ہو کر دھیمی سی آواز میں کہا۔ ”میں آپ کے گھر میں جا رہا ہوں۔ میں اپنا کام اُدھور انہیں چھوڑ سکتا۔“

”بلوے کیا لیتے ہیں۔“ اُس نے کہا۔ ”آپ جو مانگیں گے نقد حاضر کروں گا۔ مکان کے اندر نہ جاتیں۔“

مکان کا دوروازہ دُور نہیں تھا۔ میں اُس طرف چل پڑا۔ اُس نے میرے راستے میں آنے کی کوشش کی۔ میں نے دروازے کو ٹھٹھا مارا اور اندر چلا گیا۔ مجھے ایک جوان لڑکی نظر آئی۔ اُس نے مجھے دیکھا اور گھونگھٹا گرا کر ایک طرف ہو گئی۔ میں نے اُس کے لباس سے جان لیا کہ یہ بڑے ٹھاکر کی بہو ہے۔ رنگ سا نالا اور نقش و نگار میں کوئی کشش نہیں تھی۔

اسے اپنی بیماری کی مندوری کی وجہ سے اپنی بیوی پر مکی اعتماد تھا۔ لہذا اس پر قتل کا شک بے بنیاد تھا۔ اُس کی جسمانی حالت بھی ایسی تھی کہ وہ بیوی کو اس طریقے سے قتل نہیں کر سکتا تھا جس طرح وہ قتل ہوتی تھی۔ یہ پتہ چل گیا تھا کہ ٹھاکر کا بیٹا مقتولہ کو پھانسنے کی کوشش کرتا تھا۔ اس سے مجھے یہ خیال آیا کہ مقتولہ نے اُسے باہر سے کیا ہوگا۔ اس سے پیسے لیتی رہی اور دوستی کسی اور سے لگالی۔ ٹھاکر کے بیٹے نے فرعونیت کا مظاہرہ کیا اور اسے قتل کر دیا۔ مگر تلاش اپنے ہی باغیچے میں کیوں پھینکی؟ اسے قتل کہاں کیا؟ اپنے گھر میں کیا ہوگا!

تھانے سے چار کانٹیل آپکے تھے۔ میں نے تمام کانٹیلوں اور ہیڈ کانٹیل کو ہدایت دی کہ مزار عول اور نوکروں کے جھونپڑوں کے اندر جا کر اچھی طرح تلاشی لیں۔ اندر اور باہر بھی زمین دیکھیں جہاں جہاں سے کھانڈی یا لٹو کہ ملے وہ لے آئیں۔ خون دیکھیں۔ لٹوئی ہوتی پوڑی کا کوئی ٹکڑا دیکھیں۔ ایک پاؤں کی جوتی دیکھیں اور قتل کا کوئی ٹھوس ثبوت تلاش کریں۔ میں نے انہیں وار دات کے متعلق ضروری کوائف اور اپنے شکوک بتا دیے۔ انہیں روانہ کر کے میں نے ٹھاکر اور اُس کے بیٹے سے کہا کہ میں اُن کے مکان کے اندر جانا چاہتا ہوں۔ بڑا اٹھا کہ مجھے لڑیں دیکھنے لگا جیسے میں نے کفر بک دیا ہو۔ پولیس کا اُس کے گھر داخل ہونے کا مطلب خانہ تلاشی تھا، اور خانہ تلاشی مُلزمانوں کی کی جاتی ہے۔



اس کی نسبت مقتولہ خوبصورت تھی مگر اُس کی قسمت اس لئے بُری تھی کہ وہ غریبوں کے گھر پیدا ہوئی تھی۔ باپ بیٹا میرے پیچھے اندر آ گئے۔ میں نے صحن میں بکھرے ہوئے سامان، لکڑیوں کے ڈھیر اور غسل خانے کو اچھی طرح دیکھا۔ دو کمرے تھے۔ دو لڑکیاں میں گیا۔ پلنگوں کے نیچے دیکھا۔ لڑکیوں کے پیچھے دیکھا اور کوئی ایسی جگہ نہ چھوڑی جہاں کچھ چھپایا جاسکتا تھا۔ کچھ نہ ملا۔

### مقتولہ اتنی کچی نہیں تھی

باہر آیا تو کانسٹیبل جھوٹروں کی تلاشی لے آتے تھے انہوں نے تین چار کلہاڑیاں اور اتنے ہی لوہے کے برآمد کئے تھے میں نے ہر ایک کو غور سے دیکھا۔ سو گھا۔ آہ قتل انہی میں ہو سکتا تھا لیکن مجھے کوئی آثارِ نظر نہ آتے ہیں نے یہ تمام ہتھیار رکھ لئے۔ ہر ایک کے ساتھ اُس آدمی کے نام کی چرچی لگا دی جس کے گھر سے ہتھیار برآمد ہوا تھا۔ یہ سب مجھے معائنے کے لئے بھیجنے تھے۔

”داروغہ صاحب اُبڑے ٹھاکر نے مجھے بے چین ہو کر کہا۔ ”ان (مزارعوں) پلیچوں کے ہاں تو یہی کچھ ہوتا رہتا ہے۔ انہیں ہم جانتے ہیں، آپ نہیں جانتے۔ ان سب کو بٹھا کر دھمکی دیں۔ سالوں کو اٹلا لوگاتیں تھیں آپ کے سامنے آجاتے گا۔ مجھے اجازت دیں۔ میں ملزم پکڑ دیتا ہوں۔“

”پھر میرے پاس آپ کیوں دوڑے آتے تھے؟ میں نے کہا۔“  
”قاتل کو پکڑ کر ساتھ لے آتے۔“  
میں نے ٹھاکر کے بیٹے کو الگ بٹھالیا اور اُس کے باپ کو دُور بیٹھنے کو کہا۔ بیٹا اچھا جوان تھا۔

”مقتولہ تمہارے گھر میں کام کرتی تھی؟ میں نے پوچھا۔“  
”زیادہ تر باغیچے میں کام کرتی تھی۔“ اُس نے جواب دیا۔ ”کبھی کبھی گھر میں بھی اُسے کسی کام پر لگایا جاتا تھا۔“  
”اس کا چال چلن کیسا تھا؟“

”اچھا نہیں تھا۔“  
”تم نے کس طرح جانا کہ اچھا نہیں تھا؟ میں نے کہا۔“ جس کسی کے ساتھ اس کا دوستاں تھا اُس کا نام لو۔“  
”میں کسی کا نام تو نہیں لے سکتا۔“ اُس نے پریشان سا ہو کر کہا۔  
”وہ کچھ ایسی ہی تھی۔“

”میں پوچھتا ہوں تم کس طرح کہہ رہے ہو کہ اس کا چلن اچھا نہیں تھا۔“ میں نے پوچھا۔ ”تم نے اُسے آزمایا تھا؟“

”نہ جی۔“ اُس نے جواب دیا۔ ”ہم ان لوگوں سے مُنہ نہیں لگاتے۔“  
”سُنو میرے دوست! میں نے اُس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔ ”تمہارا اگر یہ خیال ہے کہ مرنے والی غریب مزارع کی بیوی تھی اور میں تقشیش میں کوئی دلچسپی نہیں لوں گا تو یہ خیال دل سے نکال دو میری

کا کوئی تعلق نہیں۔ میری مزید جرح کے بعد اُس نے تسلیم کر لیا کہ مقتولہ پر اُس کی نظر تھی اور اسی نیت سے اُسے پیسے دیتا تھا۔ میں نے اُس پر اور زیادہ دباؤ ڈالا، سوال در سوال کے چکر دیتے تو اُس نے بتایا کہ وہ مقتولہ کے ساتھ چھپڑ چھپڑ کرتا رہتا تھا اور مقتولہ اُسے وعدوں پر بٹالتی رہتی اور بار بار کہتی تھی کہ اُسے اپنے خاوند کے علاج کے لئے پیسوں کی ضرورت ہے۔ وہ اُسے دیتا رہتا تھا۔

”اس کا مطلب یہ ہوا کہ اپنے خاوند کی صحت کے متعلق وہ بہت پریشان رہتی تھی“ میں نے کہا۔

”جہت زیادہ داروغہ جی“ اُس نے کہا۔ ”میں نے ایک روز اُسے کہا کہ کیوں اس آدمی پر پیسہ تباہ کر رہی ہو۔ وہ آدھا مچر چکا ہے مرنے والا ہے۔ تمہیں تو ایک سے ایک اچھا خاوند مل سکتا ہے۔ اُس نے کانوں پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ ”نہ ٹھاکر جی! ایسی بات مُنہ سے نہ نکالیں۔ میں تو خاوند کو اپنی زندگی دینے کو تیار ہوں۔“ ان لوگوں کی عورتوں کی کوئی عزت نہیں ہوتی نہ کوئی اخلاق ہوتا ہے۔ ہم جسے اشارہ کر دیں وہ ہمارے قدموں میں بیٹھ جاتی ہے لیکن یہ عورت معلوم نہیں کس مٹی کی بنی ہوئی تھی۔ اپنے خاوند کو بوجھتی تھی۔ بعض اوقات رو کر مجھ سے پیسے لیتی تھی۔“

مختصر یہ کہ چھوٹے ٹھاکر کی باتوں سے میں اس نتیجے پر پہنچا کہ مقتولہ کوئی ایسی آوارہ نہیں تھی جیسا اس کلاس کی عورتوں کو سمجھا جاتا تھا، اور یہ

نظر میں مقتولہ انسان کی بھی تھی۔ میں قاتل کو پکڑ کر دم لوں گا۔ مجھے پریشان کرو گے تو ساری عمر بھٹتاؤ گے۔ ہو سکتا ہے بھٹانے کے لئے زندہ نہ رہ سکوں۔ اگر اُسے تم نے مارا یا مروا دیا ہے تو میرے کان میں کہہ دو کہ یہ تمہارا کام ہے۔ میں تمہاری مدد کروں گا۔ اگر میں نے تفتیش کر کے پکڑا تو اپنا انجام سوچ لو۔“ اُس نے انکار کیا۔ قسمیں کھانے لگا۔

”اُس کے ساتھ تمہارے تعلقات قابلِ اعتراض تھے۔“ میں نے کہا۔

”یہ بالکل غلط ہے۔“ اُس نے جواب دیا۔  
”یہ نہ کہو کہ یہ بالکل غلط ہے۔ یوں کہو کہ وہ ابھی تمہارے جال میں نہیں آئی تھی۔“ میں نے کہا۔ ”تم اُسے خالٹو پیسے دیتے تھے۔ وہ اپنے خاوند کے لئے دوائی لاتی تھی۔“ میں نے اپنے قیافے کے مطابق کہا۔  
”وہ جہاں کام کرتی تھی تم وہاں اس کے گرد منڈلانے لگتے تھے۔ تم اُسے گھر کے کام پر لگاتے تھے مگر بیوی کی موجودگی میں تم اپنی خواہش پوری نہیں کر سکتے تھے۔“ وہ خاموشی سے سنتا رہا۔ اُس کے چہرے کا رنگ بدل رہا تھا۔ میں نے کہا۔ ”تم نے محسوس کیا کہ وہ تمہیں انگلیوں پر سنبھا رہی ہے اور تمہارے پیسے کھاتے جا رہی ہے۔ تم نے اُسے قتل کر دیا۔“

اُس نے ٹپ ٹپ کر اور قسمیں کھا کھا کر کہا کہ قتل کے ساتھ اُس

## غریب عورت، بد معاش مزارعہ

میں نے ٹھاکر کو نارغ کر دیا لیکن یہ تفتیش کا ابتدائی مرحلہ تھا۔ میں ابھی ہر ایک مشتبہ کا ذائقہ چکھ رہا تھا۔ میں نے اس بد معاش مزارعہ سے پہلے مقتولہ کی ہمراز سہیلی کی تلاش ضروری سمجھی۔ عورتوں سے پوچھا تو دو جوان لڑکیاں سامنے آئیں۔ وہ واقعی اُس کی ہمراز تھیں۔ بہت سے سوالوں اور جوابوں سے میں نے یہ معلومات حاصل کیں کہ مقتولہ چالاک اور ہوشیار تھی۔ اپنے خاوند کی صحت کے لئے وہ بہت پریشان رہتی تھی اور کہتی تھی کہ اسے وہ تندرست کر کے دم لے گی۔ چھوٹے ٹھاکر کے متعلق اکثر ان دونوں سہیلیوں کو وہ بتاتی رہتی تھی کہ اُسے پھانسنے کی کوشش میں لگا رہتا تھا اور مقتولہ اُسے انگلیوں پر سچاتی رہتی تھی۔ اُس سے پیسے لے آتی تھی۔ چھوٹے ٹھاکر کے متعلق اُنہوں نے بتایا کہ بڑھو سا آدمی ہے۔ اس کی بیوی میں کوئی کشش نہیں۔ وہ مزارعوں اور لوگوں کی بہو بیٹیوں کے پیچھے پھرتا رہتا ہے۔ مقتولہ چونکہ سب سے زیادہ خوبصورت تھی، اس لئے اس کی توجہ اُسی پر مرکوز تھی۔

ان لڑکیوں نے بد معاش مزارعے کا بھی ذکر کیا اور بتایا کہ مقتولہ اس آدمی کی تعریفیں کیا کرتی تھی اور وہ مقتولہ میں بہت دلچسپی لیتا تھا۔ مقتولہ نے انہیں کبھی بتایا نہیں تھا کہ اس کے ساتھ اُس کے تعلقات کیسے

بھی کر اپنے خاوند کے ساتھ اسے بہت محبت تھی اور وہ اُس کے علاج کے لئے پریشان رہتی تھی۔ چھوٹے ٹھاکر کو میں نے مزید کریدار تو اُس نے مزارعوں میں سے ایک آدمی کا نام لیا اور کہا۔ ”اس آدمی کے ساتھ مقتولہ کے گہرے مراسم تھے اور میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ اس کے ساتھ مقتولہ کا غلط قسم کا دوستانہ تھا، اور میں یہ بھی کہہ سکتا ہوں کہ مقتولہ نے اس آدمی کو دھوکہ دیا ہو گا۔ یہ آدمی بد معاش ہے، جرم کرنے سے نہیں ڈرتا۔ اُس نے مقتولہ کو قتل کر کے لاش یہاں پھینک دی ہوگی۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس بد معاش نے مقتولہ سے کہا ہو کہ وہ خاوند کو مرنے دے اور اُس کے ساتھ شادی کر لے یا اُس کے ساتھ بھاگ چلے مقتولہ کشش والی عورت تھی۔ چالاک بھی تھی اور دلیر بھی۔ اُس میں ایک غریبی یہ بھی تھی کہ ہنس مکھ تھی۔ کبھی کبھی خاوند کے لئے روئی تھی، ورنہ وہ تو ایسی تھی کہ روئوں کو ہنسنا دیتی تھی۔“

”تم نے ایسا بد معاش مزارعہ کیوں رکھا ہوا ہے؟“ میں نے پوچھا۔ ”اپنی ضرورت کے تحت“ اُس نے جواب دیا۔ ”اتنے سارے مزارعوں اور لوگوں کو ہم غور تو نہیں سنبھال سکتے۔ ایک دو بد معاش ہوں تو انہیں اونچی بات نہیں کرنے دیتے۔ لیوں سمجھیں کہ ہم نے اس بد معاش کو بال رکھا ہے۔ یہ شخص جوان ہے۔ ابھی تک اُس نے شادی نہیں کی۔ کوئی کام نہیں کرتا لیکن اجرت سب سے زیادہ لیتا ہے۔“

ہیں۔ ان لڑکیوں کو شک تھا کہ معاملہ گڑبڑ ہے۔

”کیا یہ ممکن ہو سکتا ہے کہ مقتولہ نے اس آدمی کے ساتھ دھوکہ کر کے کسی اور کے ساتھ دوستی لگالی ہو اور اس آدمی نے مقتولہ کو قتل کر دیا ہو؟“ میں نے پوچھا۔

ان لڑکیوں نے بتایا کہ یہ آدمی ٹھاکر کا پالا ہوا بد معاش ہے۔ وہ قتل کر سکتا ہے لیکن مقتولہ نے شاید کسی اور کے ساتھ دوستی نہیں لگائی۔ ایک لڑکی نے کہا۔ ”وہ (مقتولہ) شہر بھی جاتی تھی۔ حکیم سے دوائی لینے بھی جاتی تھی۔ وہاں اس کا کہیں دل لگ گیا ہو گا جو اس نے ہمیں نہیں بتایا۔“

میں نے اور کچھ اخذ کیا یا نہیں، میں نے یہ سوچا کہ مقتولہ کی طرح کوئی خراب صورت بیوی مجبور اور محتاج ہو جاتے تو اسے مرد دینے والے تو بہت ہوتے ہیں لیکن اس سے ہر کوئی مرد کی قیمت وصول کرتا ہے۔ ہر کوئی اس کی مجبوری سے فائدہ اٹھا کر اسے کھلونا بنانے کی کوشش کرتا ہے۔ میں اس نتیجے پر پہنچا کہ مقتولہ کی غربت، خاوند کی بیماری اور اس کی شکل و صورت اس کی کمزوریاں بن گئی تھیں۔ سب یہ سمجھتے تھے کہ غریب کی تو عزت ہی نہیں ہوتی۔ یہ عورت اسی چکر میں کسی کے ہاتھوں قتل ہو گئی اور لاش اس لئے ٹھاکر کے باغیچے میں پھینچی گئی کہ قتل کا شبہ ٹھاکر یا مزارعوں پر ہو۔ قاتل نے یہ نہیں سوچا کہ خون کی غیر موجودگی راز فاش کر دے گی۔ یہ سب کچھ سوچنے کے باوجود میں نے ٹھاکر اور اس کے بیٹے

کو مشتبہ فہرست میں رکھا۔

میرے پاس ابھی بہت وقت تھا۔ میں نے رات تک وہیں پوچھ گچھ کرنے کا ارادہ کر لیا تھا۔ کھوجی ابھی واپس نہیں آیا تھا۔ مجھے امید تھی کہ وہ کہیں یہ کہیں کھڑا جا نکالے گا۔ اس سے میرا کام آسان بھی ہو سکتا تھا اور مشکل بھی۔ اگر مقتولہ باغیچے سے میل دو میل دور قتل ہوئی ہے تو مشتبہ افراد میں تبدیلی اور اضافہ لازمی تھا۔ میں نے بد معاش مزارعے کو بلایا۔ وہ ہٹا کٹا جوان تھا۔ میں نے اسے غور سے دیکھا۔ جسم کے لحاظ سے وہ پالا ہوا سائڈ گنگنا تھا۔ اس کا چہرہ بتاتا تھا کہ یہ مزارعہ ان پرٹھ ہو سکتا ہے احمق نہیں ہو سکتا اور یہ چالاک بھی ہے۔ اس نے میرے ساتھ ہاتھ ملایا۔ وہ فدیوں کی طرح جھکا نہیں۔ اس کے انداز میں غلامی نہیں تھی جو ان لوگوں میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوتی ہے۔ میں جان گیا کہ اس آدمی کے ساتھ مجھے ہوشیار ہو کر بات کرنی پڑے گی۔

”مقتولہ کا چال چلن کیسا تھا؟“ میں نے اس سے پوچھا۔

”اچھا تھا۔“ اس نے جواب دیا۔

”میں تم سے یہ امید رکھوں گا کہ تم جھوٹ نہیں بولو گے۔“ میں نے کہا۔ ”ایک عورت قتل ہو گئی ہے۔ مجھے قاتل کو پکڑنا ہے تمہاری مدد کے بغیر میں کامیاب نہیں ہو سکتا۔“

”آپ کو شاید یہ جھوٹ لگا ہے کہ میں نے مقتولہ کا چال چلن اچھا بتایا ہے۔“ اس نے کہا۔ ”آپ بھی ان ٹھاکر والے، ساہوکاروں اور

مدد کی ضرورت ہے، اس لئے میں آپ کو اپنے دل کی بات سنارہا ہوں۔ اس کے علاوہ مرنے والی کے ساتھ مجھے دلی ہمدردی تھی .... داروغہ جی! میں شریف آدمی نہیں ہوں۔ سب مجھے بد معاش اور غنڈہ کہتے ہیں۔ مجھے بد معاشی اور غنڈہ گردی کی اجرت ملتی ہے لیکن میرے اندر انسان کا دل ہے۔ اس عورت کو میں سب سے زیادہ نظر سے دیکھتا تھا۔ میرا خیال تھا کہ اپنے بیمار خاوند سے یہ تنگ آگئی ہوگی اور مجھ جیسے آدمی کے ساتھ نوز آدوستی کر لے گی۔ اُس نے مجھے دوستی کا دھوکہ دیا اور کہا کہ وہ میرے ساتھ گھر سے بھاگ چلے گی۔ اُس نے مجھ سے پیسے مانگے۔ میں نے دے دیتے ....

”اُس نے مجھے تین چار بار ملا تو میں سمجھ گیا کہ جھوٹے وعدے کر رہی ہے۔ میں نے ایک شام اُسے پکڑ لیا۔ ہم چھوٹیڑوں سے کچھ دُور تھے۔ میں اُس کے راتے میں کھڑا تھا۔ میں نے اُسے کہا کہ خاوند کا علاج چھوڑ دو۔ یہ اپنی موت مر جاتے گا، اور اگر پسند کر تو میں تمہیں کچھ لا دیتا ہوں۔ دوانی کے رہانے اُسے کھلا دو۔ کسی کو پتہ نہیں چلے گا۔ میں نوز اُس کی اڑھتی اٹھوا کر جلانے کا انتظام کر دوں گا .... داروغہ حضور! وہاں اندھیرا تھا۔ میں نے اندھیرے میں اُس کی سسکیاں سنیں پھوٹی دیر بعد اُس نے کہا۔ بھوٹا ٹھاکر مجھے پیسے دیتا ہے اور وہ بھی میرے ساتھ ایسی ہی باتیں کرتا ہے جیسی تم کر رہے ہو۔ مجھے تو یہ اُمید تھی کہ تم میری حفاظت اُس سے زیادہ کرو گے جتنی ٹھاکر کی کرتے

پنڈتوں کی طرح یہی کہتے ہوں گے کہ ہم جیسے لوگوں کا چال چلن ہوتا ہی کوئی نہیں۔ ہم مزدور اور محتاج ہیں۔ آپ ہمارے مُنہ پر ہر طرح کی کالک مل سکتے ہیں۔“

آدمی عقل والا معلوم ہوتا تھا۔ اُس کے بولنے کے انداز میں جان بھنی۔ میں نے اُسے ٹوکا نہیں۔ وہ کہہ رہا تھا۔ ”جس عورت کے خاوند کو بیمار سی معذور کر دے اور عورت کو اس خاوند سے اتنی محبت ہو کہ اُس کے لئے اپنا خون بھی قربان کرتی پھرے وہ ہر اُس آدمی کی جو رُو بن جاتی ہے جس کے آگے وہ دو چار پیسوں کے لئے ہاتھ پھیلاتی ہے۔ اور اگر عورت ٹھاکر کی مزدور یا مزارعہ ہو تو اُس کی عزت کو بلا خوف خرید لینا بڑا نہیں سمجھا جاتا۔ یہ عورت ایسی ہی مجبور تھی کہ خاوند کے علاج کے لئے بھیک مانگتی پھرتی تھی اور جو اُسے بھیک دیتا تھا وہ اس کی عزت کے ساتھ کھیلنا چاہتا تھا۔“

”کون کون اس کی عزت کے ساتھ کھیلے؟ میں نے پوچھا۔

”کوشش کرنے والے بہت تھے۔ اُس نے جواب دیا — ”لیکن یہ ہوشیار نکلی۔ سب کو اچھا، کل آؤں گی، کہہ کر اپنا کام نکالتی رہی۔“ ”تم یہ بات کس طرح یقین سے کہہ سکتے ہو کہ وہ دامن بچاتی رہی؟“ ”جو عورت مجھے سچا گئی اُس کے لئے یہ ڈھیلے ڈھیلے ٹھاکر اور نیم وغیرہ تو کوئی ہستی نہیں رکھتے تھے۔“ اُس نے بلا جھجک کہا۔ ”آپ نے کہا ہے کہ جھوٹ نہ بولنا۔ آپ نے یہی کہا ہے کہ آپ کو میری

”کیا یہ شک کیا جا سکتا ہے کہ مقتولہ کو ٹھاکر نے قتل کر لیا ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”اس شخص میں اتنی ہمت اور جرات نہیں ہے۔“ اُس نے جواب دیا۔ ”وہ بے چاری مر گئی ہے اور بھیدا اپنے ساتھ لے گئی ہے۔ میں کہہ نہیں سکتا کہ اُس کے اور ٹھاکر کے درمیان کیا بات ہوئی اور وہ کس طرح اور کس وقت قتل ہو گئی۔ ہمارے لوگ بھٹو کے ننگے ہیں کسی نے ٹھاکر سے رقم لے کر اس عورت کو قتل کر دیا ہو گا۔ میں کھوج لگانے کی کوشش کر رہا ہوں۔ اگر شہر میں وہ کسی کے جال میں آگئی ہو تو وہ میرے علم میں نہیں۔“

”مقتولہ تمہیں سب کچھ بتا دیتی تھی۔“ میں نے کہا۔ اُس نے کسی اور کا کبھی نام نہیں لیا تھا؟

”یہی بتاتی تھی کہ جہر جاتی ہوں لوگ بھٹو کی نظروں سے دیکھتے ہیں۔“ اُس نے کہا۔ ”اُسے زیادہ پریشانی چھوٹے ٹھاکر کی طرف سے تھی۔ اس نے اُسے دھمکی بھی دی تھی۔“

اس آدمی نے مجھے متاثر کر لیا تھا۔ مجرم اور عادی بد معاش چالاک ہوتے ہیں۔ زبان کے تپ بھی دکھاتے ہیں لیکن ذرا تجربہ ہو تو چہرے سے پتہ چل جاتا ہے کہ یہ شخص کس حد تک سچا ہے۔ میں نے اس آدمی پر اعتبار کر لیا اور اُس مزارعہ کو بلایا جس نے لاش دیکھی تھی۔ میں نے بد معاش مزارعہ سے اس شخص کے متعلق پوچھا کہ وہ کیسا ہے۔ اُس نے بتایا کہ اتنا

ہو، لیکن تم اجرت کے بھوکے ہو۔ میں تمہاری ذات برادری کی بیٹی ہوں۔ تم میں غیرت ہوتی تو اپنی ذات کی بیٹی کا خیال کرتے۔ تم مرد نہیں ہو۔ جو مردانگی تم میں ہونی چاہیے تھی وہ مجھ میں ہے۔ میں اس کے ساتھ گھر سے بھاگ آئی تھی۔ وہ بیمار ہو گیا ہے۔ اسے چھوڑ کر نہیں بھاگوں گی۔ تم نے مجھے جو پیسے دیتے ہیں وہ واپس کر دوں گی۔ تم بے غیرت ہو۔۔۔

”داروغہ صاحب! اُس نے میرا خون گرا دیا۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ چھوٹا ٹھاکر بھی اُسے میری طرح پھانسنے کی کوشش کر رہا ہے۔ میں نے اس عورت کے سر پر ہاتھ رکھ دیا اور کہا۔ آج سے مجھے اپنا بھائی سمجھو۔ وہ بہت روتی۔ میں نے دوسرے دن چھوٹے ٹھاکر سے کہا کہ میں مزارعوں وغیرہ کو دہلتے رکھنے کے لئے بد معاشی اور ظلم کرتا ہوں لیکن یہ سن لو کہ میں تمہیں اپنی کسی عورت کے ساتھ بد معاشی نہیں کرنے دوں گا۔ وہ پہلے تو ہنسا، پھر اُس نے اس عورت کا نام لے کر کہا کہ اسے چھانسن دو۔ مجھے طیش آگیا۔ میں نے اُسے کہا کہ مجھے کبھی سمجھتا ہوں؟ اسی عورت کے متعلق تو تمہیں کہہ رہا ہوں کہ اس پر بُری نظر نہ رکھنا۔ وہ مجھ پر رعب کسے لگا۔ اُس نے یہ بھی کہا کہ میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ میں نے اُسے کہا کہ یہ دُنیا دیکھ گئی کہ کون زندہ ہے اور کس کی لاش کھیتوں میں پڑی ہے۔ وہ ڈر گیا۔ میں روزانہ مقتولہ سے پوچھنے لگا کہ چھوٹے ٹھاکر نے اُسے کوئی ایسی ویسی بات تو نہیں کہی۔ اُس نے بتایا کہ ٹھاکر کہتا ہے کہ وہ (مقتولہ) مجھ سے تعلقات توڑ لے۔“

دلیر نہیں کہ کسی کو قتل کرے اور آتنا بزدل بھی نہیں کہ لاپچ سے اندھا ہو کر قتل نہ کرے۔

میں نے اس آدمی سے پوچھا کہ وہ رات کے آخری پہر بیگنوں کے کھیت میں کیا کرنے گیا تھا۔ اُس نے بتایا کہ رہٹ چلایا تھا اور کسی اور کیاریوں والے کھیت کو پانی لگانا تھا۔

”تم نے اندھیرے میں لاش کس طرح دیکھ لی تھی؟“ میں نے پوچھا۔  
”مینیڈھ کے ساتھ ہی پڑی تھی نظر آگئی۔“

”پھر تم نے کیا کیا؟“  
”ماچس جلا کر دیکھا۔“ اُس نے کہا۔ ”پھر میں چھوٹے ٹھاکر کو جگانے چلا گیا۔“

”اُس نے وہاں جا کر لاش دیکھی تھی؟“  
”جی ہاں۔“ اُس نے جواب دیا۔ ”وہ لائین جلا لایا اور ہم دونوں نے لاش دیکھی۔“

”ٹھاکر نے کیا کہا تھا؟“  
”اُس نے حیران ہو کر کہا تھا۔“ اُسے اس بد بخت کو کس نے مار ڈالا؟“ پھر اُس نے گالی دے کر کہا تھا کہ یہ ہر کسی کو دھوکے دیتی پھرتی تھی۔ چھوٹے ٹھاکر نے اس (بد معاش مزارے) کا نام لیا اور کہا تھا کہ یہ اس کی کارستانی ہوگی۔“

میں نے اس شخص پر بہت جرح کی مگر کچھ ہاتھ نہ آیا۔ اسے میں نے

مشتبہ کی فہرست میں شامل کر لیا۔ ضروری نہیں تھا کہ پہلی ہی پوچھ گچھ میں مجھے سراغ مل جاتا۔ اس مزارے کے گھر سے کھارڑی برآمد ہوتی تھی۔ میں نے اسے اپنے ہیڈ کانسٹیبل کے ساتھ یہ کہہ کر بھیج دیا کہ اس کی جوتی لے آئے۔ جاتے واردات پر پودوں کے پتوں پر جو گھرے ملے تھے وہ ننگے پاؤں کے نہیں جوتی کے تھے۔

”بڑے ٹھاکر کے متعلق تمہارا کیا خیال ہے؟“ میں نے بد معاش مزارے سے پوچھا۔

”شیطان ہے۔“ اُس نے جواب دیا۔ ”عورت کے معاملے میں رکشش ہے۔ اُس کی بیوی مر چکی ہے۔“

”مقتولہ نے کبھی اُس کا ذکر نہیں کیا تھا؟“  
”نہیں۔“ اس نے جواب دیا۔ ”وہ شہر میں رہتا ہے۔ مقتولہ شہر جایا کرتی تھی۔ ہو سکتا ہے اس کے گھر جاتی ہو۔“

## قبرستان میں خون

میرے دماغ میں تفتیش ایک اور رخ بدلنے لگی۔ مجھے بڑا ٹھاکر قتل میں ملوث ہونا نظر آنے لگا۔ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ اُس نے مقتولہ جیسی شکل و صورت اور عمر کی لڑکی کو منظر انداز کیا ہوگا۔ ہو سکتا ہے مقتولہ نے اُس کی رقم ہضم کر کے اُسے دھوکہ دینے اور اُس کے جال سے بچنے

نہ شہر والے گھر کی بھی تلاشی لوں گا اور باپ بیٹے کو رگڑوں گا۔ اتنے میں کھوجی واپس آگیا۔ تھکن سے اُس کا چہرہ زرد ہو گیا تھا۔ اودھیر عمر آدمی تھا۔ وہ میرے سامنے بھیجی ہوئی چار پانی پر تقریباً گر پڑا۔ کھڑا اٹھانا آسان کام نہیں ہوتا۔ جسم کی نسبت دماغ پر اور آنکھوں پر زیادہ زور پڑتا ہے۔  
”مار گئے لالہ؟“ میں نے کہا۔

اُس نے ان دونوں آدمیوں کی طرف دیکھا، پھر مجھے دیکھا میں سمجھ گیا۔ میں نے دونوں مزارعوں کو وہاں سے اٹھا دیا۔  
”آپ کو ایک اور رپورٹ نہیں ملی؟“ کھوجی نے پوچھا۔

”نہیں تو“ میں نے چونک کر کہا۔ ”کوئی اور مارا گیا ہے؟“  
”یہ تو کوئی اور مارا گیا ہے یا میں نے اس قتل کا موقعہ واردات معلوم کر لیا ہے۔“ اُس نے کہا۔ ”میں نے کھڑا اٹھایا تو نالے کے کنارے جا پہنچا۔ (وہاں ایک خشک نالہ تھا) کھیتوں کی مینڈھوں پر کھڑا بہت ہی مشکل سے ڈھونڈا۔ دیکھ لیں، سارا دن گزر گیا ہے۔ بیس بیس قدم تو کوئی کھڑا ملتا ہی نہیں۔ کتنی طرف بھٹک بھٹک کر کھڑا ملا اور نالے میں اتر گیا۔ پار گیا تو کھڑا خالی کھیتوں میں سے ہوتا قبرستان میں جا پہنچا۔ آدمی ایک نہیں دو ہیں۔ جہاں تک کھڑے نے پہنچا وہاں قبرستان میں رہنے والا ایک ملنگ بیٹھا ہوا تھا۔ اُس نے کہا کہ صبح سے پہرے پر بیٹھا ہوں تھالے سے کوئی نہیں آیا۔“

میرا ایک کانٹیل کھوجی کے ساتھ تھا۔ اُس نے مجھے ان الفاظ

کی کوشش کی ہو اور ٹھاکر نے اُسے اپنے گھر میں قتل کر کے پا کر اس کے لاش یہاں پھینک دی ہو، مگر سوچنے والی بات یہ تھی کہ لاش اُس نے اپنے باغیچے میں کیوں پھینکوائی؟ دوسری صورت یہ تھی کہ چھوٹے ٹھاکر نے مقتولہ کے پیچھے اپنے گھر میں فساد پیدا کر رکھا ہو۔ اُس کی بیوی تو یونیسی تھی۔ اُس کے گھر کی ناچاتی کی اطلاع بڑے ٹھاکر کو مل گئی ہو۔ اُس نے اپنے بیٹے کو برا بھلا کہا ہو جس کا کچھ اثر نہ دیکھ کر اُس نے مقتولہ کو راستے سے ہٹانے کے لئے اُسے قتل کر دیا ہو۔ یہاں پھر سوال پیدا ہوا کہ لاش اپنے ہی باغیچے میں کیوں پھینکی گئی؟

مجھے اس پر بھی غور کرنا تھا کہ بڑے ٹھاکر نے مجھ پر زور دیا تھا کہ میں تفتیش نہ کروں اور کیس گول کروں۔ اُس کے اس مشورے یا مطالبے میں ان عزیز لوگوں کی نفرت بھی پانی جاتی تھی اور شک بھی کہ قتل کی واردات اسی نے کرائی ہے۔ میرے لئے ضروری ہو گیا تھا کہ بڑے ٹھاکر کو بھی مشتبہ قرار دے کر اُسے تھانے لے چلوں اور اس کے گھر کی تلاشی لوں، پھر مزارعوں سے یہ معلوم کروں کہ رات کون سا مزارعہ عیا نو کر بڑے ٹھاکر کے گھر گیا تھا۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ دن کا پچھلا پہر تھا۔ میں نے ایک کانٹیل کو اپنے گھر بھیج کر اپنا کھانا گواہا تھا۔ باغیچے میں سب بند و تھے۔ میں اُن کا کھانا نہیں کھا سکتا تھا۔ میں ابھی کسی نتیجے پر نہیں پہنچا تھا کہ قتل کی واردات کہاں ہوتی اور قاتل کون ہے۔ میں نے یہ طے کر لیا تھا کہ بڑے ٹھاکر



قبرستان پہنچنے کے لئے اُٹھ کھڑا ہوا۔ میں نے کانٹیلوں کو بلا کر تھانے چلنے کو کہا۔ ہیڈ کانٹیل کو اپنے ساتھ رکھا۔ کانٹیلوں کے ساتھ جنہیں تھانے چلنے کو کہا ان میں بڑا ٹھکانا اور اُس کا بیٹا تھا۔ بدعاش مزار عا اور وہ مزار عہ بھی تھا جس نے لاش دیکھی تھی۔ میں نے کانٹیلوں کو سختی سے ہدایت دی کہ بڑے ٹھکانے کو اپنے گھر ایک منٹ کے لئے بھی نہ جانے دیں۔ وہ بہت پٹایا۔ اُس نے منٹ سماجت کی اور رشوت بھی پیش کی۔ مجھے آخر دھمی دینی پڑی کہ وہ تھانے نہ گیا تو میں ہتھکڑی لگا کر لے جاؤں گا۔

## انسانی پنجر، عبرت ناگ

قبرستان قبضے کے ساتھ تھا۔ باغیچے اور قبرستان میں یہ فرق تھا کہ قبرستان جنوب میں اور باغیچہ مغرب میں تھا۔ میں قبرستان میں کھوجی اور ہیڈ کانٹیل کے ساتھ اُس راستے سے گیا جس راستے یہ دونوں کھڑے دیکھتے گئے تھے۔ کھوجی لے جگہ جگہ نشان لگا رکھے تھے۔ وہاں مجرموں کے کھڑے تھے۔ خشک نالے میں ریتی مٹی تھی۔ وہاں کھڑے زیادہ صاف تھے۔ ان میں سے ایک کھڑا اس کھڑے کے ساتھ ملتا تھا جو بیگنوں کے کنارے میں لاش کے قریب دیکھا گیا تھا۔ راستے کے کھڑے بتاتے تھے کہ یہ دو آدمی ہیں۔ نالے میں جہاں ریتی مٹی تھی وہاں کھڑے ایک جگہ گڑبڑ تھے۔ تھوڑا آگے جا کر داتیں بائیں ہو گئے تھے۔

میں رپورٹ دی۔ ”قبرستان کے ساتھ ایک نشیب میں بہت سا خون پڑا ہے۔ اس سے کچھ دور ایک جوتی پڑی ہے۔ راستے میں ایک جگہ چادر نما دوپٹہ پڑا ہے جو خون سے لچھڑا ہوا ہے۔ جوتی اور دوپٹے کو ہم نے وہیں رہنے دیا ہے۔ ان کے ارد گرد ڈھیلے اور پتھر رکھ آتے ہیں۔ منگ نے بتایا ہے کہ اُس نے سورج نکلنے کے بعد یہ خون دیکھا تھا۔ اسے شک ہو گیا تھا کہ یہ کسی انسان کا خون ہے۔ منگ نے یہ بھی بتایا کہ اُس نے رات کو ایک بیچ نسی تھی لیکن وہ باہر نہیں نکلا تھا۔ دوسرے دن خون دیکھ کر وہ تھانے چلا گیا۔ ہم تو یہاں تھے۔ وہ تھانے میں کسی کانٹیل کو بتایا اور خون کی رکھوالی پر بیٹھ گیا۔ وہ ابھی تک آپ کے انتظار میں بیٹھا ہے۔“

یہ مقتول کا ہی خون ہو سکتا تھا۔ کھوجی اور یہ کانٹیل کھڑا دیکھتے وہاں تک پہنچے تھے۔ جوتی اور دوپٹہ شہادت دیتے تھے کہ مقتول کو وہیں قتل کیا گیا ہے جہاں خون ہے۔ اگر یہ رپورٹ مجھے جلدی مل جاتی تو میں فوراً وہاں پہنچتا۔ بعد میں پتہ چلا کہ قبرستان کے منگ نے تھانے میں جا کر اطلاع دی تھی لیکن وہاں کوئی ذمہ دار آدمی نہیں تھا۔ میرا سہ۔ ایس۔ آئی کسی کیس کی گواہی دینے باہر گیا ہوا تھا۔ ہیڈ کانٹیل میرے ساتھ تھا۔ پیچھے جو رہ گئے تھے انہیں قبرستان میں خون کی رپورٹ ملی تو اسے اہمیت نہ دی۔ انہوں نے مجھے باغیچے میں اطلاع دینے کی بجائے میری واپسی کا انتظار بہتر سمجھا۔ اتفاق سے مجھے رپورٹ مل گئی۔ میں فوراً

ہو گئی تھیں۔ میں نے ایک قطار میں ایسے پانچ چھ ڈھلپنچے دیکھے۔ کھوپڑیاں دیوار میں پھنسی ہوتی تھیں۔ باقی ڈھانچوں میں سے کچھ ہڈیاں نیچے گر پڑی تھیں۔ منظر ڈراؤنا تھا اور جذباتی بھی معلوم نہیں یہ کون تھے اور کیسے تھے جن کی ہڈیاں ننگی ہو گئی تھیں اور گرے بھی رہی تھیں۔ زندگی میں یہ زمین پہنچ کر سے سراؤ سنایا کر کے چلتے پھرتے ہوں گے۔ اپنے سے کمتر انسان کو انسان ہی نہیں سمجھتے ہوں گے۔ اس غلط فہمی میں مبتلا ہوں گے کہ ہم جیسا کوئی دوسرا پیدا ہی نہیں ہوا۔ انہوں نے کبھی سوچا بھی نہیں ہو گا کہ ان کی اصلیت یہ ہے کہ مٹی کے ساتھ مل کر مٹی ہو جائیں گے اور ان کی ہڈیاں الگ الگ ہو کر بہہ بائیں گی۔ میں نے ان کی کھوپڑیوں اور ڈھانچوں کو دیکھا۔ انہیں زمین نے جبراً رکھا تھا۔ انکھوں کے سوراخوں اور منہ میں مٹی بھری ہوتی تھی۔ پسلیوں کے جس پنجے میں اچھی بُری خواہشوں اور اچھے بُرے ارادوں سے بھرا ہوا دل ہوتا کرتا تھا وہاں بھی مٹی بھری ہوتی تھی۔

ان میں کوئی پنجہ کسی عورت کا ہو گا جسے اپنے خُسن پر ناز ہو گا اور کوئی کسی مرد کا ہو گا جسے اپنی مردانگی اور دولت پر فخر ہو گا مگر سب حشرات الارض کی غوراک بن گئے، اور اب ان کے پنجہ عبرت کا سامان بنے ہوئے تھے۔ مگر ہم میں سے کوئی بھی عبرت حاصل نہیں کرتا۔ ہم میں سے کوئی بھی یہ تسلیم نہیں کرتا کہ ایک روز اس کی بھی ہڈیوں کا پنجہ زمین کی گرفت میں ہو گا۔ جھوٹ بولنے والے مُنہ میں مٹی بھری ہوتی

”کچھ سمجھ آتی داروغہ جی؟“ کھوجی نے پوچھا اور کہا۔ ”یہاں ایک آدمی نے لاش اپنے کندھوں سے اتار کر دوسرے آدمی کے کندھوں یا پیٹ پر رکھ دی ہے۔ آگے دیکھیں۔“ اُس نے پاؤں کے دو نشان دکھا کر کہا۔ ”یہاں لاش اس آدمی نے اٹھا رکھی ہے۔ دوسرے آدمی پر کوئی وزن نہیں۔“ یہ کھوجیوں کا کمال ہوتا ہے کہ کھڑا دیکھ کر بتا دیتے ہیں کہ اس آدمی نے وزن اٹھا رکھا ہے یا نہیں۔ بعض تجربہ کار کھوجی وزن کا اندازہ بھی بتا دیا کرتے تھے۔

نالے کے دوسرے کنارے پر چڑھے تو دو پیٹہ پڑا تھا۔ یہ عام راستہ نہیں تھا۔ مجرموں نے فاصلہ کم کرنے کے لئے اصل راستہ چھوڑ دیا تھا۔ میں نے دو پیٹہ اٹھا کر دیکھا۔ اس پر بے شمار خون خشک ہو گیا تھا۔ ایک جگہ سے دو پیٹہ کٹا ہوا تھا۔ یہ حصہ سر پہ تھا۔ کلہاڑی اس جگہ لگی تھی۔ یہ بلا شک و شبہ مفتوکہ کا دو پیٹہ تھا۔ قبرستان میں گتے تو کھوجی مجھے ایک نشیب میں لے گیا۔ یہ ایک وسیع نشیب تھا۔ برسات میں قبرستان کا پانی اس نشیب میں گرتا تھا۔ نشیب کے اُس طرف کے دو کنارے جو قبرستان کی طرف تھے دیوار کی طرح عمودی تھے۔ کسی زمانے میں یہ نشیب بھی جسے آپ قدرتی تالاب بھی کہہ سکتے ہیں قبرستان کا حصہ تھا۔ برسات کا پانی اس کے کنارے بہتا رہا اور یہ وسیع ہوتا رہا۔

اس کے ایک عمودی کنارے کے وسط میں انسانی ڈھلپنچے نظر آتے۔ یہ بہت ہی پُرانی قبریں تھیں جو صدیوں کی بارشوں سے ننگی

ہوگی۔ کھوپڑی خالی ہوگی۔ لگنا ہوں کے خیالوں کی جگہ مٹی بھری ہوتی ہوگی۔ اگر ہم سب اپنا انجام اپنے سامنے رکھیں تو ہم سب کسی وعظ کے بغیر بیاد اور محبت، نیکی اور عبادت کے پتیلے بن جائیں۔

میں انسان کی اصلیت دیکھ رہا تھا۔ وہ جہاں سے آیا تھا اُسے وہیں پڑا دیکھ رہا تھا۔ پھر مجھے یاد آگیا کہ میں تھانیدار ہوں۔ میں ان سوچوں سے نکل آیا اور اپنے انجام کو ذہن سے اتار کر تھانیدار اور داروغہ حضور بن گیا۔ مجھے خون دکھایا جا رہا تھا۔ یہ خون نشیب کی دیوار سے تین چار گز دُور تھا۔ اس سے ڈیڑھ دو گز اوپر ایک انسانی ڈھانچہ مٹی کی دیوار میں پھنسا ہوا تھا۔ وہاں سے کھودی ہوتی مٹی نیچے آتی ہوئی تھی۔ بنجر کے نیچے جگہ ڈھلائی تھی۔ میں نے دیکھا کہ اس بنجر کے ساتھ کھوپڑی نہیں ہے۔ جہاں کھوپڑی ہونی چاہیے تھی وہاں صاف منظر آ رہا تھا کہ جگہ کھودی گئی ہے۔ مجھے یہ سمجھنے میں بھی دشواری نہ ہوتی کہ یہاں سے کھوپڑی نکالی گئی ہے۔ باقی جو بنجر تھے اُن کی کھوپڑیاں اُن کے ساتھ تھیں۔

### واردات پُر اسرار ہو گئی

قبرستان کے ملنگ نے یہ عقلمندی کی تھی کہ وہاں خون دیکھ کر اپنے ایک ساتھی کا پھر لگا دیا اور خود تھانے چلا گیا تھا۔ واپس آ کر

وہ خود پہرے پر بیٹھ گیا تھا۔ اس سے یہ فائدہ ہوا کہ کھڑے محفوظ رہے تھے۔ میں نے خون کے ارد گرد زمین پر دیکھنا شروع کیا تو مجھے ایک دو ٹوٹی ہوئی چوڑیوں کے ٹکڑے نظر آئے۔ میں نے مقتولہ کے بازو سے جو چوڑیاں توڑ کر جیب میں رکھی تھیں ان کے ساتھ ملائے۔ وہ ایک جیسے تھے۔ وہی قسم، وہی رنگ۔ چند قدم دُور جو تکی کا ایک پاؤں پڑا تھا۔ وہ اٹھایا۔ یہ مقتولہ کا تھا۔ دوسرے پاؤں کی جو تکی میرے پاس تھی۔ خون میں بھے تین چار لمبے لمبے بال مل گئے۔ یہ زناہ بال تھے۔ وہاں دو آدمیوں کے کھڑے تھے۔ مقتولہ کے تڑپنے کے نشان بھی تھے۔

واردات پُر اسرار ہو گئی۔ مجھے کچھ سوال پریشان کرنے لگے۔ مقتولہ یہاں کس طرح آئی؟ کیوں آئی؟ کیا اسے لایا گیا تھا؟ کس نیت سے لایا گیا تھا؟ مجھے ابھی پوسٹ مارٹم رپورٹ نہیں ملی تھی اس لئے مجھے معلوم نہیں تھا کہ قتل سے پہلے مقتولہ کے ساتھ کیا سلوک ہوا ہے میں اس بنجر کی کھوپڑی کو بنظر انداز نہیں کر سکتا تھا جو خون کے اوپر کنارے کے وسط میں زمین سے پیوست تھا۔ وہاں سے کھوپڑی نکالی گئی تھی اور کھدائی کی مٹی تیار ہی تھی کہ ایک دن سے زیادہ پُرانی نہیں۔ میں نے ذہن پر زور دیا تو مجھے یاد آیا کہ مقتولہ کے ناخنوں میں مٹی پھنسی ہوئی دیکھی تھی۔ تو کیا یہ کھوپڑی مقتولہ نے نکالی تھی؟ اس خیال سے مجھے یہ خیال آیا کہ مقتولہ اپنے خاوند کی بیماری سے پریشان تھی مجھے بتایا گیا تھا کہ اس نے کئی جگہوں سے علاج کرایا تھا۔ یہ ممکن تھا کہ کسی کے بتانے پر وہ کوئی

ٹوڑنے کے لئے یہاں سے کھو پڑی نہ کالنے آتی ہو اور کسی مسلمان نے اسے دیکھ لیا ہو اور اسے قتل کر دیا ہو، مگر چونکہ یہ بھیگی ہوئی لاش اٹھا کر کے باغیچے میں کیوں پھینکی گئی؟ اگر کسی مسلمان نے جوش میں آکر اور مقتولہ کو ہندو سمجھ کر قتل کر دیا ہو تو لاشیں یہیں پڑی رہنے دیتا۔ مجھے ملنگ کا خیال آیا جس نے خون دیکھا تھا۔ اُس سے میں نے بہت کچھ پوچھا۔ اُس نے بتایا کہ رات اُس نے ایک چرخ سنی تھی۔ اُس وقت وہ چرخ کے لئے میں تھا۔ صبح وہ نشیب کے وسط میں جو تھوڑا سا پانی جمع تھا وہاں ہاتھ منہ دھوے آیا تو اُسے خون نظر آیا۔ اُسے رات کی چیخ یاد آئی۔ اس سے اُس نے شک کیا کہ رات یہاں کوئی قتل ہوا ہے۔ وہ تھانے چلا گیا۔ ملنگ قبرستان میں ایک کوٹھڑی میں رہتا تھا جو موقعہ وار دات سے تقریباً پچاس قدم دور تھی۔

یہ وہ واردات تھی جو تھانیداروں اور سرانفرسانوں کو بھول بھلیوں میں پھینک دیتی ہے۔ باہر نکلنے کا راستہ ہی نہیں ملتا۔ زمین بھی خاموش ہو جاتی ہے۔ مجھے اٹھا کر اور اُس کا بیٹا بے گناہ نظر آنے لگے۔ وہ مقتولہ کو یہاں لاکر کیوں قتل کرتے؟ مجھے کوئی جواز نہیں مل رہا تھا۔ یہ دو آدمی کوئی اور تھے جن کے وہاں کھرے منظر آرہے تھے.... میں نے دیکھا، کھوجی غائب تھا۔ معلوم نہیں کہاں چلا گیا تھا۔ بہت دیر بعد وہ نشیب کی دوسری طرف سے جہاں ڈھلان بھی اتنی زری سے اُترتا آ رہا تھا۔ وہاں سے اُس نے مجھے اشارے سے بلایا میں گیا۔ اُس نے مجھے مین کھرے دکھائے۔

”مقتولہ دو آدمیوں کے ساتھ ادھر سے آتی تھی“ اُس نے کہا۔  
”میں قبرستان میں تھوڑی دور تک دیکھ آیا ہوں۔ ان تینوں کے آنے کی سمت معلوم ہو گئی ہے۔“

میں نے آگے جا کر دیکھا۔ اگر کھوجی نے سراغ پالیا تھا تو مقتولہ باغیچے کی طرف سے نہیں دوسری طرف سے آتی تھی۔ اُس کے ساتھ دو آدمی تھے۔ کیا یہ تینوں کھو پڑی نہ کالنے آئے تھے؟ میں سوچ سوچ کر بیٹھا اٹھا۔ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ کھو پڑی ایک رات پہلے کسی اور نے لٹائی ہو اور مقتولہ کو یہ دو آدمی بُری نیت سے یہاں لاتے ہوں اور بعد میں اسے قتل کر دیا ہو مگر پھر اسی سوال نے میرا راستہ روک لیا کہ لاش اٹھا کر باغیچے میں کیوں پھینکی گئی؟ اس سوال کا یہ جواب میرے ذہن میں آیا کہ یہ دو آدمی عادی مجرم ہوں گے۔ انہیں معلوم ہو گا کہ یہ اٹھا کر کے باغیچے کی عورت ہے۔ چنانچہ انہوں نے پولیس کو گمراہ کرنے کے لئے لاش اٹھا لی اور باغیچے میں جا پھینکی مگر مجھے اپنی اس دلیل میں کوئی جان منظر نہیں آتی تھی۔

## ایک آدمی آسمان سے اُترا

میں قبرستان میں کھڑا تھا۔ کھوجی مجھے کھرے دکھا رہا تھا میرے ہیڈ کانسٹبل نے سر سے ایک طرف اشارہ کر کے مجھے کہا۔ ”وہ آدمی

جمو دور کھڑا ہے، اسے ذرا غور سے دیکھیں۔ میں نے اُس کی طرف ایسے انداز سے دیکھا جیسے خاص طور پر اُسی کو نہ دیکھا ہو۔ میں نے ادھر سے منہ پھیر کر ہیڈ کانسٹبل سے پوچھا۔ ”کیا ہے اس آدمی میں؟“

”یہ مجھے دوسرے تماشائیوں سے مختلف لگتا ہے۔“ ہیڈ کانسٹبل نے جواب دیا۔ ”ہم نیچے گہرائی میں تھے تو میں نے اسے دوسرے کنا سے پر الگ تھلک کھڑے دیکھا تھا۔ دوسرے تماشائی ہمارے سر پر کھڑے تھے۔ ہم جب باغیچے سے کھڑے دیکھتے آ رہے تھے تو میں نے اسے دو رو دور اپنے ساتھ آتے دیکھا تھا۔ اس سے پہلے ہم جب باغیچے میں لاش دیکھ رہے تھے تو بھی میں نے اسے دور کھڑے دیکھا۔ مجھے یہ بھی یاد آتا ہے کہ ہم جب صبح تھانے سے نکلے تھے تو یہ آدمی تھانے کے احاطے سے باہر کھڑا تھا۔ ہم احاطے سے نکلے تو یہ پرے چلا گیا تھا۔ یہ صبح سے یہیں دیکھ رہا ہے، رہتا دو رو دور ہے۔“

کھوجی سن رہا تھا۔ اُس نے زمین پر بیٹھے بیٹھے اس آدمی کو دیکھا اور بولا۔ ”میں جب باغیچے سے کھڑا اُٹھا کہ اس طرف آیا تھا تو میں نے بھی اس آدمی کو دیکھا تھا۔ دو رو دور ہماری رفتار سے چلتا آ رہا تھا۔ میں کانسٹبل کے ساتھ جب واپس آپ کو ساتھ لائے گیا تو بھی اسے دو رو دور باغیچے کی طرف جاتے دیکھا تھا۔“

ہیڈ کانسٹبل نے مجھ پر کوئی عجیب و غریب انکشاف نہیں کیا تھا۔

یہ عام طور پر ہوتا ہے کہ قتل یا ڈاکے کی جاتے واردات پر جب پولیس جاتی ہے تو تماشائی جمع ہو جاتے ہیں۔ مجرم بھی بعض اوقات تماشائیوں میں شامل ہو کر دیکھنے لگتے ہیں کہ پولیس کیا کر رہی ہے اور اسے کیا سراغ ملا ہے۔ مجرم خود نہ آتیں تو ان کے جاسوس آ جاتے ہیں۔ اسی لئے میں تماشائیوں کو دو رو دور بھاگا دیا کرتا تھا۔ ہیڈ کانسٹبل کو بجا طور پر شک ہوا تھا کہ یہ آدمی عام قسم کا تماشائی نہیں۔ اس کا ہمارے ساتھ لگے رہنا بے معنی نہیں تھا۔ میں نے ہیڈ کانسٹبل سے کہا کہ اسے یہاں بلاؤ۔ وہ ہم سے کوئی ڈیڑھ سو گز دور ہو گا۔ ہیڈ کانسٹبل نے اُسے ”اے بھائی، ذرا یہاں آنا“ کہہ کر بلایا۔ اُس نے داتیں باتیں اور پیچھے دیکھا۔ ہیڈ کانسٹبل نے بلند آواز سے کہا۔ ”میں تمہیں بلارہا ہوں۔“ بھاگ گئے آؤ۔“ اُس نے پیٹھ ہماری طرف کر لی اور آہستہ آہستہ دوسری طرف چل پڑا۔ ہیڈ کانسٹبل میرے کہنے پر اس کے پیچھے گیا۔ اس آدمی نے پیچھے دیکھا اور تیز چل پڑا۔ میں نے کہا۔ ”پکڑ لاؤ اسے۔“ ہیڈ کانسٹبل دوڑ پڑا۔ اس آدمی نے پیچھے دیکھا اور وہ بھی دوڑ پڑا۔ میں ابھی جوان تھا۔ تدکی وجہ سے قدم لمبے تھے۔ میں پوری رفتار سے دوڑا۔ آگے سے دو تین آدمی آ رہے تھے۔ انہیں آواز دی کہ اس آدمی کو پکڑیں۔ انہوں نے اس کا راستہ روکا تو اُس نے رُخ بدل لیا۔ کجنت قدموں کا تیز تھا۔ وہ جلد دوڑا ادھر کھیت تھے میں نے بھی رُخ بدل لیا۔

دوڑتے دوڑتے مجھے خیال آیا کہ میں احمق تو نہیں؟ لوگ پولیس

”آؤ میرے ساتھ ذرا آرام کرو۔ ڈرتے کیوں ہو؟“  
میں نے اُس کا بازو پھڑپھڑا اور چلا تو وہ وہیں جما کھڑا رہا۔ میں نے اُسے  
گھسیٹا تو وہ بیچھڑ گیا۔ میرے منہ کی طرف اس طرح دیکھ رہا تھا کہ اُس کا منہ کھلا  
ہوٹا تھا اور آنکھوں کے ڈھیلے باہر آرہے تھے۔ میں نے اُسے اٹھنے کے  
لئے کہا تو وہ مجھے بدستور دیکھتا رہا۔  
”یہ کوئی پاگل تو نہیں؟“ ہیڈ کانسٹیبل نے کہا۔

اُس کا انداز پاگلوں جیسا ہی تھا۔ میں نے اس کا نام پوچھا تو بھی وہ  
مجھے دیکھتا رہا۔ میں نے پوچھا کہاں کے رہنے والے ہو؟ اُس نے قصے  
کی طرف سر سے ہلکا سا اشارہ کیا۔ پوچھا مسلمان ہو؟ اُس نے سر سے ہلکا  
سا اشارہ کیا کہ مسلمان ہوں۔ میں نے اُسے اٹھنے کے لئے کہا مگر وہ مجھے  
دیکھتا رہا۔ اٹھا نہیں کھوجی کو میں نے دیکھا۔ وہ زمین کو غور سے دیکھ رہا  
تھا۔ اُس نے میری طرف دیکھا اور اشارہ کیا جس کا مطلب یہ تھا کہ اس  
آدمی کو ساتھ لے چلو کھوجی نے زمین پر اس کی جوتی کے نشان دیکھ لے  
تھے جو واردات والے کھڑول سے ملتے تھے۔ یہ دیسی جوتی کے نشان تائیں تھے  
اس آدمی کی جوتی دیسی نہیں تھی۔

## مجھے بچالو

ہم اُسے کچھ اٹھا کر کچھ دھکیل کر اور کچھ گھسیٹ کر لے گئے قبرستان

سے ڈرتے ہیں۔ بعض پر دہشت ظاری ہو جاتی ہے۔ یہ آدمی یولیس  
سے دہشت زدہ ہونے والا ہو سکتا تھا۔ بہت بڑا دل ہو گا۔ میں اُتوؤں  
کی طرح اُس کے پیچھے دوڑ پڑا۔ بات کچھ بھی نہ نکلی تو میں شرمندگی کا مقابلہ  
کس طرح کروں گا مگر میری اُس وقت ذہنی حالت ایسی تھی کہ میں تنکوں  
کے سہارے ڈھونڈ رہا تھا۔ واردات ایک منہ معلوم ہوتی تھی جسے  
پراسرار کہا جاتا ہے۔ میری تفتیش کو کوئی معجزہ ہی کامیاب کر سکتا تھا۔  
میں نے لتا قب جاری رکھا۔ وہ جدھر جا رہا تھا، اُدھر سے دوہین دینا  
آ رہے تھے۔ انہیں میں نے پکارا کہ اسے پکڑیں۔ اس آدمی نے نکل  
بھاگنے کی بہت کوشش کی۔ میں نے ریلو اور فائر کرنے کے ارادہ کیا لیکن  
فائر کیا نہیں کیونکہ مجھے یہ خیال بھی آ رہا تھا کہ یہ آدمی صرف ڈر سے بھاگ  
رہا ہو گا۔ گولی چاہا، نیگین معاملہ ہوتا ہے۔

دو مہاتمیوں نے اُسے روک کر بیٹھ لیا۔ میں جب اُس تک پہنچا  
تو اُس کی سانسیں اس قدر اکھڑی ہوئی تھیں کہ بات نہیں کر سکتا تھا۔ اُسے  
یہ ڈر تھا کہ میں اُسے مایوں پیٹوں گا۔ میں نے ایسا کوئی ارادہ نہیں کیا  
تھا۔ مجھے غصہ ضرور آیا تھا لیکن میں بادشاہ قسم کا تھا نہ دار نہیں تھا۔ میں  
نے اُسے ہنس کر کہا ”بھاگنے کی کیا ضرورت تھی؟ ہم تمہیں کھا جاتیں  
گے؟“ اُس کی آنکھیں ابل کر باہر آرہی تھیں۔ مجھے دیکھ جا رہا تھا،  
بولتا کچھ بھی نہیں تھا۔

”نہ گھبراؤ یا رہ؟“ میں نے اُس کے کندھے دبا تے ہوئے کہا۔

”تم غالباً یہ چاہتے ہو کہ میں پولیس والا رویہ اختیار کروں۔“ میں نے ذرا رعب سے کہا۔ ”ہمارے آگے پتھر بھی بولنے لگتے ہیں۔ کون ہو تم؟ کیا کام کرتے ہو؟“

”حکیم کا بھتیجا ہوں۔“ اُس نے بڑی مشکل سے جواب دیا۔ ”یہاں کیا کرنے آتے تھے؟“

”ویسے ہی۔“

”بھاگے کیوں تھے؟“ وہ خاموش رہا۔ کھوجی نے اُس کا کھڑا دیکھ لیا تھا۔ میں اس آدمی کو اتنی آسانی سے چھوڑنا نہیں چاہتا تھا۔ میں نے پوچھا۔ ”اس قتل کے ساتھ تمہارا کیا تعلق ہے؟“

اُس کا جسم بڑی زور سے کانپا اور وہ میرے قدموں میں گر پڑا۔ اس نے سر میرے پاؤں پر رکھ دیا۔ دونوں ہاتھوں سے میرے ٹخنے پکڑ لئے۔ میں نے اُسے اٹھایا۔ وہ ہچکیاں لے رہا تھا۔ آنسو بہے جا رہے تھے۔

”خدا کے بندے!۔“ میں نے جھنجھلا کر کہا۔ ”کہ دو میرا اس قتل کے ساتھ کوئی تعلق نہیں اور مجھے سمجھا دو کہ تم مجھ سے کیوں ہمارے ساتھ ساتھ رہے ہو۔ میں تمہیں چھوڑ دیتا ہوں۔“

وہ روتا ہی رہا۔ اُس نے ہاتھ جوڑ کر سرگوشی کی۔ ”مجھے بچالو۔ میں آپ کا مسلمان بھائی ہوں۔“

کانٹک دو چار پائیاں اٹھا لیا تھا۔ چار پائیاں وہاں رکھی گئیں جہاں خون پڑا تھا۔ اس آدمی کو جہاں چار پائی پر بٹھایا گیا وہاں سے اُسے خون منظر آ رہا تھا۔ وہ ادھر ٹکھی باندھ کر دیکھنے لگا۔ اُسے پانی پلایا۔ وہ سر سے پاؤں تک کانپ رہا تھا۔ اُس کے ہاتھوں کی یہ حالت تھی کہ پانی پینے لگا تو مٹی کا پیالہ اُس کے ہاتھوں میں جھٹک رہا تھا۔ پانی اس کے کپڑوں پر بھی گرا۔ میں نے اُس کا ڈر دور کرنے کے لئے ہنس کر کہا۔ ”اوتے تم مسلمان کے بچے ہو کر اتنا ڈرتے ہو حوصلہ رکھو۔ ہم نے تمہیں ویسے ہی بلایا تھا۔“ مگر اُس کا حوصلہ ٹٹتا ہی جا رہا تھا۔

”بھاگے کیوں تھے؟۔“ میں نے پوچھا۔

اُس کا رنگ زردی سے بدل کر سفید ہو گیا اور وہ خاموش رہا۔ ”ہم سے ڈر گئے تھے؟“

وہ خاموش رہا۔ اُس کا سر ڈولنے لگا۔ چہرے پر پسینے کے قطرے چھوٹ آتے اور وہ چار پائی پر لٹ جھٹک گیا۔ اُس پر فحشی طاری ہو گئی تھی۔ اُس کے منہ پر پانی کے چھینٹے مارے۔ تماشا نشانی کچھ دور کھڑے تھے۔ انہیں کہا کہ کہیں سے دو وہ لے آؤ۔ ایک آدمی دوڑا گیا۔ اُس کا گھر کہیں قریب ہو گا۔ دو وہ کا پیالہ لے آیا۔ اتنی دیر میں اس آدمی نے آنکھیں کھول دیں۔ اٹھا کر اسے دو وہ پلایا۔ وہ ہوش میں تو آ گیا لیکن بولتا نہیں تھا۔ میں اسے الگ لے گیا۔ پیار اور شفقت سے اسے بات کرنے پر آمادہ کرنے کی کوشش کی مگر بے سود۔

نے مجھے مقتولہ کے پوسٹ مارٹم کے متعلق بتایا۔ اُس نے پوسٹ مارٹم کیا تھا۔ اُس نے موت کا جو وقت بتایا وہ آدھی رات یعنی رات بارہ بجے سے ڈیڑھ یا دو گھنٹے پہلے تھا۔

اس رپورٹ سے یہ ثابت ہو گیا کہ مقتولہ کو کسی اور نیت سے قتل کیا گیا ہے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ یہ انتقامی قتل تھا لیکن میں حیران اس پر تھا کہ عورت سے جب انتقام لیا جاتا ہے تو اس کے ساتھ قتل سے پہلے وحشیوں اور زندوں جیسا سلوک کیا جاتا ہے۔ اس کیس میں ڈاکٹر کہہ رہا تھا کہ قاتل یا قاتلوں نے کوئی ایسی حرکت نہیں کی۔

میں اس آدمی کو تھانے لے آیا۔ راستے میں اس کے ساتھ دوستانہ سی باتیں کرنے کی کوشش کی لیکن اس نے تعاون نہ کیا۔ تھانے جا کر میں نے ایک ہندو کانسٹبل کو دیسی شراب لانے کو بھیجا۔ ڈاکٹر نے اس آدمی کو جو گولیاں دی تھیں ان کا اثر نظر آنے لگا تھا اس کے جسم کا زہرہ ختم کیا تھا۔ میرا خیال تھا کہ اسے شراب دھوکے میں پلاؤں گا لیکن اس نے دھوکے کے بغیر ہی قبول کر لی۔ کانسٹبل نے غلطی کی کہ بوتل لاکر میری میز پر رکھ دی۔ میرا مشتبہ بوتل کی طرف دیکھنے لگا میں نے مسکاکر پوچھا۔ ”پیو گے؟“ اُس نے سر ہلایا۔ میں نے گلاس اور پانی منگوایا۔ بوتل اور گلاس اُس کے آگے کر دیتے۔ میں اسے آزا چھوڑنے کے لئے باہر نکل گیا اور بڑے بھاگتا ہوا اُس کے بیٹے سے باتیں کرنے لگا۔

”پھر یوں کہو کہ اس واردات کے ساتھ تمہارا کمرالعلق ہے؟“ وہ پھر بھی خاموش رہا اور اُس کی حالت پھر ویسی ہی ہونے لگی جیسی غشی سے پہلے ہوتی تھی۔ سولج غروب ہونے کو تھا۔ میں نے موقتہ واردات کے متعلق جو کاغذی کارروائی کرنی تھی وہ مکمل کی۔ گواہ بناتے اور اس آدمی کو ساتھ لے کر میں تھانے چلا گیا۔ بھاگتا ہوا اور دو مزارے برآمدے میں بیٹھ گئے۔ مجھے دیکھتے ہی بڑا بھاگتا میرے پاس دوڑا آیا۔ کہنے لگا۔ ”آپ نے ہمیں کیوں پابند کر لیا ہے؟ ہم کب تک یہاں بیٹھ رہیں گے؟“

”جب تک مجھے آپ کی ضرورت ہے۔“ میں نے بے رخی سے کہا۔ ”آرام سے بیٹھ جاتیں۔“ اور میں اپنے دفتر میں چلا گیا۔

## شراب کام کرتی

سرکاری ہسپتال قریب ہی تھا۔ ڈاکٹر وہیں رہتا تھا۔ میں اس آدمی کو ڈاکٹر کے پاس لے گیا۔ اسے ایک کمرے میں بٹھا کر ڈاکٹر کو ساری بات سنانی اور اسے بتایا کہ اس آدمی پر مجھے شک ہے کہ واردات کے ساتھ اس کا کوئی تعلق ہے مگر یہ بولتا نہیں بے ہوش ہو جاتا ہے۔ ڈاکٹر نے اس کی نبض دیکھی اور اچھی طرح معائنہ کر کے دو گولیاں اسے کھلا دیں۔ مجھے ڈاکٹر نے الگ کر کے کہا کہ اسے شراب پلاؤ، بول اُسے گا پھر ڈاکٹر



تھی۔ بے فکر رہو۔  
 اُس کا انداز بدست شرابیوں کا تھا۔ ہنستا تھا اور قہقہے بھی لگاتا تھا۔ شراب میرا کام گنتی تھی مگر مجھے یہ غم لگ گیا کہ نشہ اُتر جانے کے بعد یہ آدمی یہ نہ کہہ دے کہ میں نے تو کوئی ایسی بات نہیں کی تھی۔ یہ خطرہ بھی تھا کہ وہ نشے کی حالت میں جو کچھ کہے وہ محض بے بنیاد ہجو تاہم اسے میں نے بولنے کا موقعہ دیا۔  
 ”حکیم کو بچھاؤ۔“ اُس نے جھوم کر کہا۔ ”وہاں سے ایک کھوپڑی ملے گی۔“ کہلاڑی بھی وہیں ہے۔“  
 اُس نے حکیم کا جوٹھکا نہ بتایا وہ قبضے سے ذرا الگ ایک مکان تھا۔ درمیان میں چند ایک کھیت تھیں۔  
 ”ابھی جاؤ۔“ اُس نے کہا۔ ”اُسے اگر پتہ چل گیا کہ میں تنہا نے میں ہوں تو وہ بھاگ جائے گا۔ مجھے اُسی نے کہا تھا کہ پوئیس پر نظر رکھو۔ اگر خطرہ ہو تو فوراً اطلاع دو۔ وہ میرا انتظار کر رہا ہوگا۔ میری جگہ تم لوگ وہاں پہنچو۔“

دو سو سال زندہ رہو جوان رہو

اس شخص سے میں نے اور جو کچھ پوچھا اور اُس نے جو کچھ بتایا اور نشے کی حالت میں اُس نے جو دلچسپ حرکتیں کیں وہ بڑی طویل تفصیلات

نصف گھنٹہ بعد میں اندر گیا تو اس آدمی نے بڑی شگفتہ آواز میں مجھ سے پوچھا۔ ”آپ نہیں بیٹھ گئے؟“  
 ”زیادہ۔“ میں نے جواب دیا۔ ”مجھے ابھی بہت کام کرنا ہے۔“  
 ”اس قتل کے سلسلے میں؟“  
 ”ہاں؟“ میں نے کہا۔ ”یہ سلسلہ تو مجھے راتوں کو جگاتے رکھے گا۔“  
 ”میں آپ کا کام آسان کر دوں؟“ اُس نے ایسے لہجے میں کہا جس میں شراب کی مستی تھی۔ خوف کا اشارہ بھی نہیں رہا تھا۔ وہ شاید اُس مقدار سے زیادہ پی گیا تھا جس کا وہ عادی تھا۔ اُس نے کہا۔ ”اگر میں آپ کا مسئلہ حل کر دوں تو مجھے کیا انعام ملے گا؟“ اُس نے ہنسنے لگا جو یہ ظاہر کرتا تھا کہ اسے اپنے آپ پر قابو نہیں رہا۔  
 ”اتنا انعام ملے گا جو ساری عمر یاد رکھو گے۔“ میں نے جواب دیا۔  
 ”ساری عمر؟“ اُس نے جھوٹے ہنسنے لگا۔ ”عمر قید۔ آپ کا مطلب سمجھ گیا ہوں۔ آپ مجھے سزائے موت کی بجائے عمر قید دلائیں گے۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ مجھے عمر قید بھی نہ ملے؟“  
 ”بالکل ہو سکتا ہے۔“ میں نے کہا۔ ”تم جانتے ہو سلطانی گواہ کیا ہوتا ہے؟“

”جانتا ہوں۔“ اس نے کہا۔ ”وعدہ ہوا؟“  
 ”پکا وعدہ۔“ میں نے کہا۔ ”تم میری مدد کرو گے تو کیا میں تمہاری مدد نہیں کروں گا؟ تمہارا مسلمان بھائی ہوں۔ مرنے والی کجنت ہندو

ہیں۔ میں آپ کو صرف کام کی باتیں سننا رہا ہوں۔ اُس کی نشاندہی بڑی قیمتی تھی۔ حکیم کے گھر پر چھاپہ مارنا تھا۔ میں نے اس آدمی کو ساتھ لے جانا چاہا۔ اسے اٹھایا لیکن وہ اچھی طرح چل بھی نہیں سکتا تھا۔ لٹنے کی حالت میں اسے ساتھ لے جانا مناسب بھی نہیں تھا۔ ہو سکتا تھا کہ نشاندہی غلط ہو لیکن مجھے چھاپہ مارنے سے کوئی نہیں روک سکتا تھا۔ میں نے نشاندہی کی تصدیق کے لئے اس آدمی سے پوچھا۔ ”اس حکیم کا مقتولہ کے ساتھ کیا تعلق تھا؟“

”وہ اپنے خاوند کے لئے دوائی لینے آیا کرتی تھی؟“ اُس نے جواب دیا۔ ”نہ حکیم دیتا تھا۔ دوائی میرے ہاتھ کی سنی ہوتی تھی۔“

میں نے جب کانسٹیبل کے ساتھ لے کر حکیم کے اس آدمی کو تھکانے میں رہنے دیا۔ سیٹڈ کانسٹیبل کو اس کے پاس چھوڑا اور میں نے جا کر حکیم کے مکان کو محاصرے میں لے لیا۔ میں نے بڑے بٹھا کر اور بد معاش مزاج کو بھی برآمدگی کی گواہی کے لئے ساتھ لے لیا تھا۔ دروازے پر دستک دی تو حکیم نے دروازہ کھولا۔ میں نے اپنا تعارف کراتے بغیر اُسے اندر کو دھکیلا اور میں اندر چلا گیا۔ میرے ساتھ ایک کانسٹیبل تھا۔ باقی پانچ مکان کے ارد گرد کھڑے تھے۔ مکان آبادی سے الگ تھلگ تھا۔ میں نے ٹھاکر اور مزارعہ کو بھی اندر بلا لیا۔

”جناب حکیم صاحب! میں نے حکیم سے نرم سے لہجے میں کہا۔“

”میں یہاں تک جو پہنچ گیا ہوں اس سے آپ سمجھ لیں کہ میں کسی شک

میں نہیں آیا پورے یقین کے ساتھ آیا ہوں۔ اگر آپ حکم دیں تو میں مکان کی تلاشی لے لیتا ہوں۔ کیا یہ بہتر نہیں ہوگا کہ قبرستان سے نکالی ہوئی کھوپڑی اور وہ کھماڑی جس سے آپ نے ایک عورت کو قتل کیا ہے خود ہی نکال دیں؟ اگر میں نے تلاشی لے کر یہ چیزیں برآمد کیں تو آپ کے ساتھ کوئی رعایت نہیں کروں گا اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ تلاشی سے آپ کے کچھ اور جراثیم بھی بے نقاب ہو جائیں۔“

اُس نے ٹالنے کی کوشش کی لیکن اُس کے منہ سے بات نکل نہیں رہی تھی۔ اُسے پتہ نہیں چل رہا تھا کہ کیا کہے اور کس طرح کہے میں نے اُسے کہا۔ ”جناب کا ساتھی میرے تھکانے میں ہے اور اقبال جرم کر چکا ہے۔ ہم آپ کو زحمت نہیں دیں گے۔“ میں نے اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر رازداری سے کہا۔ ”قتل کے لئے کوئی عادی قاتل ساتھ رکھنا تھا۔ اتنا کچا آدمی خون ہضم نہیں کر سکتا۔“

اُس کا سر جھٹ گیا۔ اُس نے سر اٹھایا اور زیر لب کہا۔ ”آؤ۔“

وہ ساتھ والے کمرے میں داخل ہوا۔ اُس کے ہاتھ میں لائٹن تھی۔ اس کمرے کی بدبو نے مجھے بچا دیا۔ کمرہ فراخ تھا۔ چھت جالوں سے اٹی ہوئی تھی۔ کمرے میں کنٹر چھوٹے بڑے مرتبان، گتھیاں اور تھیلیاں بکھری ہوئی تھیں۔ ان سب میں جڑی بوٹیاں وغیرہ تھیں کمرے میں دھواں تھا۔ ایک کونے میں انچھی میں کوئلے جل رہے تھے۔ ان پر ایک کنٹر رکھا تھا جو اوپر سے بند تھا۔ اس کے اوپر سے ٹین کا ایک پائپ ایک

ایک کھوپڑی جو تبرستان سے لکالی گئی ہے۔ تیسری چیز آپ کا اقبالی بیان ہے جو آپ دے دیں تو آپ کا مشکور ہوں گا ورنہ مجھے اس کی ضرورت نہیں۔ آپ کے جرم کی شہادت مل گئی ہے۔“

## قتل کا باعث، ابقمان حکیم کا نسخہ تھا

اُس نے کچھ اور پس و پیش کی تو میں نے دوا اور کانٹیل اندر بلا رہا نہیں کہا کہ سارے مکان کی تلاشی لو۔ حکیم ادھیڑ عمر مسلمان تھا۔ وہ ہمیں اندر جانے سے روکتا تھا، کتنا تھا اندر مستورات ہیں۔ میں نے مستورات بھی دیکھا۔ ایک کو میں اُس کی بیوی اور دوسری کو اُس کی بیٹی سمجھا لیکن اس نے بتایا کہ دونوں اُس کی بیویاں ہیں۔ اس کے چھوٹے چھوٹے بچے بھی تھے۔ اُس نے کھانا پڑی خود ہی نکال دی۔ پھر اُس نے آگ پر رکھے ہوئے کنتہ کا ڈھکنا کھول دیا کی ہوتی بجاپ بادل کی طرح اُوپر کو اُٹھی اور لمبے میں ایسی بدبو پھیل گئی کہ ہم سب ناکوں پر رومال نہ رکھ لیتے تو شاید بے ہوش ہو جاتے۔ کنتہ میں سے اُس نے کھوپڑی نکال کر باہر رکھ دی۔ لنتہ میں اس نے نہ جانے اور کیا کچھ ڈال رکھا تھا۔ میں نے اس حکیم کی شہرت سن رکھی تھی۔ دوا تیلوں کے علاوہ تعویذوں اور لٹنے لٹکوں سے بھی علاج کرتا تھا۔

مکان کی تلاشی لے کر میں نے مسیر نامہ تیار کیا۔ ٹھاکر اور مزارے

طرف کو نکلا ہوا تھا۔ اس کا دوسرا سرا بار یک تھا جس میں سے پانی کے قطرے ٹپک رہے تھے۔ یہ پانی میں سے گذرا گیا تھا۔ حکیم مجھے ذرا پرے لے گیا اور دھیمی آواز میں کہنے لگا۔ ”معاذ آپ کے ہاتھ میں ہے۔ آپ اس پر پردہ ڈال سکتے ہیں۔ قتل ہونے والی کا آگے پیچھے کوئی نہیں جو کہیں اُٹھائے گا۔ میں آپ کو ایسی دوائی دوں گا جس سے آپ دو سو سال زندہ رہیں گے اور ہمیشہ جوان رہیں گے۔ ایک درجن بیویاں گھر میں رکھیں۔ آپ کی جوانی میں فرق نہیں آتے گا۔ میں یہ دوائی صرف اپنے لئے اور راجوں مہاراجوں کے لئے بنا رہا ہوں۔“

”دو سو سال زندہ رہوں گا؟“ میں نے اُسے ٹوکتے ہوئے کہا۔  
”بلکہ اس سے بھی زیادہ۔“ اس نے کہا۔  
”نہ حکیم صاحب! میں نے شکنتہ لیجے میں کہا۔ اتنی لمبی عمر قید مجھے منظور نہیں۔ آپ مجھے ذرا جلدی فارغ کر دیں۔“  
”کچھ نقد پیش کر دو؟“ اُس نے کہا۔ ”جو آپ کہیں مجھے منظور ہوگا۔“

”اگر آپ مجھے تین چیزیں پیش کر دیں تو میں آپ کا مشکور ہوں گا۔“ میں نے کہا۔

”فرمائیے۔“ اُس نے خوش ہو کر کہا۔ ”ابھی حاضر کرتا ہوں۔“  
”ایک کھانا پڑی جس سے مقتولہ کو قتل کیا گیا ہے۔“ میں نے کہا۔

کا بیان ہوش میں لینا چاہتا تھا۔

اُس نے اقبال جرم کرنے سے پہلے مجھے ذرا پریشان کیا لیکن میری اُستادی کے آگے وہ زیادہ قائم نہ رہ سکا۔ اُس نے یہ تسلیم نہیں کیا کہ اُس کا کاروبار فراڈ ہے۔ وہ کہتا تھا کہ کھوپڑی سے جو دوائی بنا رہا تھا وہ اب حیات کا درجہ رکھتی ہے۔ اس کے کہنے کے مطابق اس دوائی میں صرف اشیاء شامل نہیں تھیں بلکہ اس میں ایک لٹرن بھی شامل تھا۔ لٹرن یہ تھا کہ کھوپڑی زمین سے یعنی قبر سے عورت نکالے۔ اس عورت پر چالیس روز ایک عمل پڑھ کر پھونکا جاتے۔ اکتالیسویں رات یہ عورت کھوپڑی نکالے۔ اس کھوپڑی کو اسی عورت کے خون سے دھویا جاتے لیکن خون عورت کے سر سے نکلے۔

آپ میں سے جو تار میں لٹرنے ٹوٹنوں سے واقف نہیں حیران ہوں گے کہ کوئی ایسا لٹرن بھی ہو سکتا ہے جو اس حکیم نے کیا تھا۔ انسان جتنے پسماندہ ہوتے ہیں اتنے ہی زیادہ اس قسم کی خسرات پر یقین رکھتے ہیں۔ ہندو عجیب و غریب لٹرنے کرتے تھے۔ ان کو دیکھا دیکھی مسلمان بھی ان کے قائل ہو گئے۔ چنانچہ پاکستان کے دور دراز دیہات میں اب بھی عجیب و غریب بلکہ بھیانک لٹرنوں کا رواج ہے۔ غریب کار عامل اور پیر وغیرہ خدا کے بعد کا درجہ حاصل کتے ہوتے ہیں۔

اس حکیم نے مجھے اپنا لٹرن سنا یا تو میں حیران نہیں ہوا۔ میں تو اس سے زیادہ خوفناک لٹرنے لٹرنے دیکھ چکا تھا۔ اس نے بتایا کہ مقتولہ اپنے

کی گواہی ڈال کر انکو مٹے لٹرنے اور حکیم کو تھانے لے گیا۔ اپنے دفتر میں داخل ہوا تو حکیم کو بھی اندر لے گیا۔ اس کا شاگرد سپید کانٹیل کو قتل کی کہانی سنا رہا تھا اور نشے میں جھپٹے لگا رہا تھا۔ حکیم کو دیکھ کر اُس نے کہا — ”آؤ، آؤ۔ یہ لو گلاس پیتو اور موج کرو۔“

حکیم نے جو گالیاں کہیں وہ اگر میں ساری لکھوں تو دو صفحوں میں آئیں گی۔ میں اگر اسے پڑھتا لیتا تو وہ اپنے جھپٹے پر لٹ پڑتا۔ کھوپڑی کانٹیل نے اٹھا رکھی تھی جو اُس نے میری میز پر رکھ دی۔ حکیم کا بھتیجا اس کے سامنے بیٹھا تھا۔ اُس نے کھوپڑی کی طرف دیکھا تو اس کا نشہ ختم ہو گیا۔ اُس کے چہرے پر وہی خوف اُگیا جو اُس وقت اس پر طاری تھا جب اُسے کھیتوں میں کپٹا گیا تھا۔ اُس کا جسم کانپنے لگا۔ میں اُسے روکھتا رہا۔ اس نے مجھے دیکھا اور کہا — ”یہ میرے آگے سے اٹھا لو.... خدا کے لئے اٹھا لو۔“ میں نے کھوپڑی وہاں سے اٹھا دی۔ یہ خوفزدگی کی انتہا تھی۔ اتنے زیادہ نشے میں بھی وہ خوفزدہ ہو گیا تھا۔ انسانی کھوپڑی کو دیکھ کر کسی انسان کا دل ٹھکانے نہیں رہتا۔ میں نے بھی جب قبرستان میں ہڈیوں کے بچھر دیکھے تھے تو مجھ پر عجیب سی کیفیت طاری ہو گئی تھی۔

میں نے حکیم سے کہا — ”آپ اگر پینا چاہیں تو پی لیں اور گھر ہیں نہیں؟“ حکیم نے گلاس بھی نہ مانگا۔ بوتل اٹھائی اور منہ سے لگالی میں نے اُسے زیادہ نہ پینے دی۔ اُسے تفتیش کے کمرے میں لے گیا اور کہا — ”میں ایک اور بوتل منگوا لوں گا۔ پہلے کام کی باتیں کر لیں۔“ میں اس

نے دے دی۔  
 اُسی روز اُس نے مقتولہ کے سر پر ہاتھ رکھ کر نئے کے الفاظ پڑھے  
 اور مقتولہ کی آنکھوں میں پھونکیں ماریں مقتولہ خوش ہوتی ہوگی کہ اب اس کا  
 خاوند صحت یاب ہو جائے گا۔ اُسے معلوم نہ تھا کہ اُس کی اپنی عمر چالیس روز  
 رہ گئی ہے۔ وہ ہر روز آنے لگی اور حکیم اس پر اپنا عمل کرتا رہا۔ اس کا شاگرد  
 جس نے شراب کے نشے میں حکیم کی نشاندہی کی تھی اس کا یتیم بھتیجا تھا اسے  
 اس عمل کا علم تھا۔ نشے میں اور بھی بہت سے اجزاء لکھے ہوئے تھے۔ وہ  
 اس کا بھتیجا تلاش کرتا رہا۔ مجھے یہ اجزاء یاد نہیں رہے صرف پچھوے کی  
 چربی یاد رہ گئی ہے جس کا حصول محال تھا لیکن عمل کے دسویں بار میں  
 روز بھتیجے نے بہت دُور سے کچوا حاصل کر لیا۔ اس کی چربی نکال لی۔

### مقتولہ نے کھوپڑی نکالی

چالیسویں روز حکیم نے مقتولہ سے کہا۔ ”مجھے اشارہ ملا ہے کہ یہ  
 عورت مُردے کی کھوپڑی لاتے۔ اس سے ایک دوائی بنے گی جو اس  
 کے خاوند کو تین دنوں میں تندرست کر دے گی۔“  
 مقتولہ ڈر گئی۔ یہ سوال بھی تھا کہ انسانی کھوپڑی کہاں سے ملے گی۔  
 حکیم نے قبرستان کے ساتھ وہ نشیبی جگہ دیکھی تھی جس کے عمودی کناروں  
 میں انسانی ڈھانچے کھوپڑیوں سمیت پھنسے ہوئے نظر آ رہے تھے۔

خاوند کے علاج کے لئے اس کے پاس آنے لگی۔ اپنے خاوند کو بھی ساتھ  
 لاتی تھی۔ حکیم نے اس کا علاج شروع کر دیا۔ مقتولہ کے متعلق اُس نے بتایا  
 کہ اپنے خاوند کے لئے روتی تھی اور کہتی تھی کہ اس کی صحت کے لئے وہ  
 ہر قربانی دینے کو تیار ہے۔ حکیم نے اعتراف کیا کہ اس عورت پر اس کی  
 نظر خراب ہو گئی تھی لیکن وہ اُسے پوری طرح اپنے اثر اور کرامات کا قیدی  
 بنا کر اپنی نیت کا اظہار کرنا چاہتا تھا۔ اس دوران اسے آباد اجداد کے  
 پرانے کاغذوں میں سے ایک نسخہ ملا جو انسان کو ناقابل یقین حد تک  
 طویل عمر دینے اور سداجوان رکھنے کا اثر رکھتا تھا۔ یہ کاغذات گھر کے  
 کوڑے کباڑ سے اتفاقیہ برآمد ہوئے۔ اس نے بتایا کہ یہ نسخہ لقمان حکیم  
 نے تیار کیا تھا۔ اُس نے نشے کی تاریخ سنائی۔

نشے میں (اُس کے بیان کے مطابق) کچھ الفاظ لکھے تھے جو ایک  
 جوان عورت پر ہر روز پڑھنے اور پھونکنے تھے۔ عورت ایسی لازمی تھی جو  
 جوان ہو شادی شدہ ہو اور اُس کے بطن سے کوئی بچہ پیدا نہ ہوا ہو۔  
 حکیم کے لئے مقتولہ مریع عورت تھی۔ مقتولہ ڈیڑھ ماہ سے اپنے خاوند کے  
 لئے دوائی لینے جا رہی تھی۔ تیسرے چوتھے دن جاتی تھی حکیم کو یہ نسخہ ملا تو  
 اُس نے مقتولہ سے کہا کہ وہ اب ہر روز اپنے خاوند کا حال بتانے آیا کرے  
 تاکہ اسے دوائی بدل بدل کر دی جاسکے۔ اُس نے مقتولہ سے یہ بھی کہا کہ  
 وہ اب دوائیوں کے ساتھ ایک عمل بھی کرے گا تاکہ دوائی تیزی سے اثر  
 کرے۔ اُس نے مقتولہ پر اثر ڈالنے کے لئے مزید نفیس مانگی جو مقتولہ

اُس نے مقتولہ سے کہا کہ اُسے اُس (مقتولہ) پر اتنا رحم آتا ہے کہ وہ کھوپڑی حاصل کرنے میں اُس کی مدد کرے گا لیکن مقتولہ کو ساتھ جانا پڑے گا۔ اُس نے یہ بھی کہا کہ اُس کا بھتیجا بھی ساتھ ہوگا۔ ڈرنے کی ضرورت نہیں۔ مقتولہ تیار ہو گئی۔ اُسے کہا گیا کہ وہ اگلی رات نہا کر آجائے لیکن کسی کو یہ نہ بتاتے کہ وہ کہاں جا رہی ہے۔ ورنہ چالیس روز کے عمل کا اثر زائل ہو جائے گا۔ مقتولہ وقت پر حکیم کے پاس آگئی۔

حکیم نے اُس پر کوئی مزید عمل کیا۔ نسخے کے مطابق اُسے کوئی دوائی کھلاتی کچرا سے دیرری دینے کے لئے شراب پلاتی۔ قصبے کے لوگ جلدی سو جاتے تھے۔ اس کے علاوہ حکیم کا مکان الگ تھلگ تھا۔ اُس نے مقتولہ کو ساتھ لیا اور قبرستان کو چل پڑا۔ اس کا بھتیجا کھوپڑی اور ایک سلاخ (کھوپڑی دلوں سے لکانے کے لئے) اٹھائے ان کے پیچھے گیا۔ وہ قبرستان میں پہنچے۔ نشیب میں اُسے حکیم نے مایوس جلا کر مقتولہ کو کھوپڑی دکھائی اور مایوس گنجا کر سلاخ اس کے ہاتھ میں دے دی۔ اسے کہا کہ اب ہاتھوں سے ٹٹول کر اور سلاخ کی نوک سے مٹی کھود کر کھوپڑی نکال لے۔ کھوپڑی اتنی اونچی تھی کہ مقتولہ کھڑی ہو کر نکال سکتی تھی۔

اُس نے کھوپڑی نکال لی۔ حکیم کے بیان کے مطابق وہ اتنا خوش ہوا جیسے اُسے خزانہ مل گیا ہو۔ اُس نے سلاخ کی نوک سے اندھیرے میں ہی کھوپڑی کے اندر سے مٹی نکالی اور اسے جھاڑ لیا۔ اب اس

کھوپڑی کو کھوپڑی نکالنے والی کے سر کے خون سے دھو یا تر کرنا تھا۔ طے ہوا تھا کہ مقتولہ کے سر پر بھتیجا کھوپڑی مارے گا مگر وقت آیا تو بھتیجا گھبرا گیا۔ اُس نے کچھ کہے لیکن کھوپڑی حکیم کے ہاتھ سے لے لی اور کھوپڑی اُسے دے دی۔ مقتولہ کی موجودگی میں وہ اصل بات نہیں کر سکتے تھے۔ حکیم سمجھ گیا۔ وہ بھتیجے کو پر سے لے گیا اور اُسے کہا کہ یہ کام مشکل نہیں۔ پیچھے سے دو وار کر دافد کام ختم۔ بھتیجے نے پوری بزدلی دکھائی اور کہا کہ یہ کام اُس سے نہیں ہوگا۔ مقتولہ اُن سے فوراً دور کھڑی تھی۔ حکیم نے اُس کے پیچھے جا کر پوری طاقت سے اُس کے سر پر کھوپڑی ماری۔ مقتولہ نے چیخ ماری۔ حکیم نے کھوپڑی سے نکالی۔ مقتولہ پیچھے کود گرنے لگی۔ حکیم نے ایک پاؤں اس کی کمر پر رکھ کر اسے سیدھا کیا اور کھوپڑی کا دوسرا وار کیا۔ مقتولہ کو اُس نے گرنے نہ دیا۔ اسے کمر سے بچر لیا اور اسے آگے کو بھٹکا دیا۔ بھتیجے سے کہا کہ کھوپڑی اس کے سر کے نیچے رکھو اور خون سے نمر کر لو۔ مقتولہ تڑپ رہی تھی۔

بھتیجے نے مقتولہ کے سر سے گرتے ہوئے خون سے کھوپڑی بھولی اور بولا کافی ہے۔ اسے پھینک دو۔ حکیم نے مقتولہ کو پھینک دیا۔ وہ کھوپڑی دیر تڑپتی رہی پھر اس کا جسم ساکن ہو گیا۔ بھتیجے کے منہ سے ایسی باتیں نکلیں جن سے حکیم کو شک ہوا کہ اس کا دماغ موقوف ہو گیا ہے۔ اس نے یہ بھی کہا۔ ”حکیم چچا! آپ نے دیکھا ہوگا کہ راستے میں دو آدمیوں نے ہمیں اس طرف آتے دیکھا تھا۔ کل صبح اس کی لاش دیکھ

حکیم نے یہ فیصلہ کیا کہ لاش اٹھا کر ٹھاکر کے باغیچے میں پھینک دی جائے۔ حکیم کو یہ شک بھی تھا کہ اس عورت کا چال چلن ٹھیک نہیں ہوگا۔ باغیچے کے مزارعے وغیرہ یہ کہیں گے کہ یہ عورت اپنی بدکاری کا شکار ہوئی ہے۔ حکیم کے بھتیجے نے اس فیصلے سے اتفاق کیا۔

اُس نے لاش اپنے کندھوں پر ڈال لی اور چچا بھتیجا چل پڑے۔ نالے میں جا کر بھتیجے نے لاش چپا کے کندھوں پر رکھی اور کھوپڑی اُس نے اٹھالی۔ وہ باغیچے کے باہر بیگنوں کے کھیت تک پہنچے اور لاش کیارے میں پھینک دی۔

منج سویرے حکیم نے دیکھا کہ خوف کے مارے بھتیجے کا حال بُرا ہو رہا تھا۔ حکیم نے نئے کے تمام اجزاء حاصل کر لے تھے۔ آخری چیز کھوپڑی تھی۔ وہ بھی مل گئی۔ اُس نے تمام اجزاء اور کھوپڑی کنستریں میں ڈالی اور عرق کشید کرنے لگا۔ بھتیجے کو دیکھا۔ اُس کا رنگ زرد ہو رہا تھا۔ حکیم نے اُسے کہا کہ تھانے کے باہر جا کر کھڑے ہو جاؤ اور دیکھو کہ پولیس باغیچے میں جاتی ہے یا نہیں۔ اگر پولیس کسی کی رپورٹ پر وہاں جاتے تو دور کھڑے ہو کر دیکھتے رہنا کہ پولیس کیا کرتی ہے۔ حکیم نے بتایا کہ شام کے بعد تک وہ دوائی بنانے میں اتنا مگن رہا کہ اُسے یاد ہی نہ رہا کہ اُس کا بھتیجا منج سے باہر گیا ہوا ہے۔ دروازے پر دستک ہوتی تو اُس نے اس امید پر دروازہ کھولا کہ بھتیجا آیا ہے مگر وہ میں تھا۔ دوسرے دن بھتیجے نے بھی اقبال جرم کر لیا جو حکیم کے اقبالی بیان

کو وہ سب کو بتا دیں گے کہ اس عورت کو ہم نے مارا ہے۔ اس نے ایسی کئی اور باتیں کہیں جن کا حکیم پر یہ اثر ہوا کہ وہ ان بے بنیاد باتوں کو سچ ماننے لگا اور اسے ایسا خطرہ نظر آنے لگا جیسے قبرستان میں کچھ لوگ چھپے ہوئے ان کے جرم کو دیکھ رہے ہوں۔

یہ دراصل وہ نفسیاتی اثر تھا جو قتل کے بعد قاتلوں پر طاری ہوا کرتا ہے۔ قتل کر دینا کوئی مشکل نہیں ہوتا۔ قتل معصوم کرنا ناممکن ہوتا ہے۔ انسانی جان لینا ایسا فعل ہے جسے کوئی عادی قاتل ہی برواشت کر سکتا ہے۔ اگر غور سے دیکھیں تو عادی قاتل بھی بڑے جتن کر کے اس بھیانک جرم کو معصوم کرتا ہے۔ حکیم کا بھتیجا تو تھا ہی بزدل، حکیم کو بھی اپنے ارد گرد خطرے منڈلاتے نظر آنے لگے۔ اس نے یہ خواب دیکھ کر یہ جرم کیا تھا کہ وہ دوائی تیار کر کے لوابول، راجول اور مہاراجول سے خزانے سمیٹ لے گا اور وہ محل جیسے مکان میں رہے گا۔ قتل کا ارتکاب کر کے غوابول کا محل پھانسی کی کوٹھڑی بن گیا۔ اُس پر ایسا خوف طاری ہوا کہ داغ جواب دے گیا۔ اس ذہنی اور جذباتی حالت میں حکیم جرم کو چھپانے کی نرکیں سوچنے لگا۔

اُسے یاد آیا کہ مقتولہ اس کے ساتھ دل کی باتیں کیا کرتی تھی حکیم اپنی ضرورت کے مطابق اس کے ساتھ بڑا اچھا سلوک کرتا تھا۔ اس نے حکیم کو بتایا تھا کہ ٹھاکر کا بیٹا اس کے پیچھے پڑا رہتا ہے۔ بد معاش مزارعہ کا بھی مقتولہ نے حکیم کے ساتھ ذکر کیا تھا۔ ان باتوں کو سامنے رکھ کر

کی تصدیق کرتا تھا۔ دونوں نے مجسٹریٹ کو قبالی بیان تکبذ کر دیتے۔  
میں نے ان پر بھروسہ کیا۔ شہادت مکمل کر لی۔ عدالت میں دونوں اپنے  
بیانوں پر قائم رہے۔ حکیم نے قتل کا الزام اپنے سر لیا تھا۔ انگریز سیشن  
جج نے خاصا لمبا فیصلہ لکھا تھا۔ اُس نے حکیم کو سزائے موت اور اس  
کے بھتیجے کو اعانت جرم میں سات سال سزائے قید دی تھی۔ جج کے  
فیصلے کے دو چار فقرے مجھے ابھی تک یاد ہیں۔ اُس نے لکھا تھا کہ اس  
مقدمے کی سماعت کے دوران میں نے یوں محسوس کیا جیسے میں افریقہ  
کے وسطی جنگلوں میں بیٹھا ہوں جہاں انسان انسان کا گوشت کھاتا ہے  
اور جہاں اس قسم کے لڑنے لڑنے کے رائج ہیں۔ آگے چل کر اُس نے لکھا  
کہ اسلام اور ہندو مت دو متضاد مذہب ہیں لیکن توہم پرستی اور  
لڑنے لڑائیوں میں ہندوستان میں مسلمان اور ہندو ایک ہی ڈگر پر  
چلتے نظر آتے ہیں۔



## جنت کے دربار میں

جرم چھوٹا ہو یا بڑا، سہوگناہ ہے لیکن اپنے آپ کو یہ تسلی دے کر  
جرم کرنا کہ کوئی پچھ نہیں سکے گا، بہت بڑی حماقت ہے۔ جرم سے کبھی  
کچھ حاصل نہیں ہوتا خواہ مجرم خزانے لوٹ کر لے جاتے۔ آج کل کی  
بات کچھ اور ہے۔ مجرموں کو پشت پناہی حاصل ہے اور یہ ثابت ہوتا  
جا رہا ہے کہ جرم کر دے تو دارے نیارے ہو جائیں گے، لیکن  
مجرمانہ زندگی کو پسند کرنے والے لوگوں کو یہ احساس نہیں رہا کہ دنیا  
کے یا اپنے ملک کے قانون کو کسی کے ساتھ مل کر دھوکہ دیا جاسکتا  
ہے، عدالتی قانون کی اندھی اور بے آواز لاشی کو نہیں روکا جاسکتا جرم  
خواہ چند روپوں کی رشوت خوردی ہو یا دکانداری میں چھوٹا سا جھوٹ ہی  
کیوں نہ بولا جاتے، سزا ضرور ملتی ہے۔

میں نے حماقت کا ذکر کیا ہے۔ میری اس کہانی کے مجرموں کو  
بھی یہی امید تھی کہ جرم کا سراغ پولیس کو ملے گا ہی نہیں۔ وہ یہ امید



بھی رکھ سکتے تھے کہ مجھے قتل کرادیں گے یا مجھے لو کرہی سے برطرف کرادیں گے۔ انہیں بہت طاقت حاصل تھی لیکن خدا میری طرف تھا۔ یہ اُس وقت کا واقعہ ہے جب انگریزوں کو بڑی امید تھی کہ وہ ہندوستان کے تاحیات تاجدار رہیں گے۔ دوسری جنگ عظیم شروع ہوتے دو تین مہینے گزر گئے تھے۔ سورج طلوع ہوئے والا تھا جب میرے بھائی کے ایک گاؤں کا ایک مسلمان زمیندار بھائی نے میں پر پورٹ لے کر آیا کہ اُس کی گھوڑی چوری ہو گئی ہے۔ مویشی اور گھوڑے چوری ہوتے ہی رستے تھے جو ہمارے لئے اس وجہ سے مصیبت کا باعث بن جاتے تھے کہ لوگ چوری کے تین چار روز بعد بھائی نے میں پر پورٹ درج کرانے آیا کرتے تھے۔ اس عرصے میں مسروقہ مویشی کے مالک اپنے طور پر سرائی کر کے رہتے تھے۔ پر پورٹ جب بھائی نے میں آتی تھی تو مسروقہ مویشی ملک کے دوسرے سرے تک پہنچ چکے ہوتے تھے۔ ہمارے لئے کوئی کھرا کھوج رہتا ہی نہیں تھا اس لئے تفتیش ناممکن ہو جاتی تھی۔ میں نے تمام نمبر داروں اور چوکیداروں کے ذریعے اپنے بھائی کے علاقے میں اعلان کر دیا تھا کہ کسی کا کوئی مال مویشی چوری ہو جائے تو اپنی سرائی کی بجائے فوراً بھائی نے میں آئے ورنہ میں پر پورٹ درج نہیں کروں گا۔ اسی اعلان کا اثر تھا کہ اس مسلمان زمیندار کو صبح پتہ چلا کہ اُس کی گھوڑی غائب ہے تو وہ سورج نکلنے سے پہلے میرے پاس آگیا۔ وہ اتنا امیر آدمی تھا کہ دس گھوڑیاں

بیک وقت خرید سکتا تھا لیکن جو گھوڑی لاپتہ ہو گئی تھی اُس جیسی گھوڑی ملنی محال تھی۔ یہ اعلیٰ نسل کی سدھانی ہوتی گھوڑی تھی۔ قدموں کی بہت تیز، نیزہ بازی کی ماہر اور دھول کی تھاپ پر ناچتی تھی۔ اس مسلمان زمیندار کو یہ گھوڑی اس لئے بھی عزیز تھی کہ یہ اُس کے باپ کی نشانی تھی۔ کوئی ایک ہی سال ہوا اُس کا باپ مر گیا تھا۔ اب باپ کی گدی اور گھوڑی اس زمیندار کے پاس تھی۔ اُس کی عمر تیس سال سے ڈیڑھ دو سال اور تھی۔ یہ کوئی خوب رو اور وجہ آدمی نہیں تھا۔ اس کا رنگ سانولا اور قد کاٹھ الیا ویسا ہی تھا۔ خدائے اپنی زمین کا بہت ساحصہ اُس کی بہت میں لکھ دیا تھا۔ اس کے باپ دادا نے انگریزوں کی بہت خدمت کی اور غلامی میں نام پیدا کیا تھا جس کے صلے میں انگریزوں نے اس خاندان کو نو زرخیز اراضی اور دربارہ میں کرسی عطا کی تھی۔ اس خاندان کی فوجی خدمات صفر کے برابر تھیں۔ ان کی خدمت کا طریقہ فخری تھا جو ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی سے شروع ہوا تھا۔ اس خاندان کے بزرگوں نے انگریزوں کے ”باغی سپاہیوں“ کی نشان دہیاں کیں اور ان مجاہدین آزادی کو سزا میں دلائی تھیں۔ اب انگریزوں کے اس انعام و اکرام کا وارث یہ جوان زمیندار تھا جس میں یہی ایک کشش تھی کہ وہ جاگیر کا شہزادہ تھا۔ دو گھوڑا بوسکی کے کپڑے پہنتا اور اعلیٰ نسل کی گھوڑی پر سوار کر کے تھتا۔ وہ بھائی نے میں آیا۔ مجھے گھر سے بلایا گیا۔ اُس کا ایک نوکر اُس کے ساتھ تھا۔ اُس نے اپنی گھوڑی کی چوری کی پر پورٹ

نے یہ بھی کہا کہ وہ خود بھی گھوڑی تلاش کرے گا۔ اُس نے کہا۔ رپورٹ درج کرانے سے میرا مطلب یہ ہے کہ اگر میں گھوڑی خود تلاش کر لوں تو آپ چور کو گرفتار کر کے سزا دلا سکیں گے۔“

میں نے رپورٹ لکھ لی۔ مجھے جن معلومات کی ضرورت تھی وہ اُس سے اور اُس کے نوکر سے لے لیں اور اپنے اسے۔ ایس۔ آئی عثمان کو کچھ ہدایات دے کر اور یہ کہہ کر اسے کھوجی کو گھر سے ساتھ لیتا ہاتھ تفتیش کے لئے زمیندار کے ساتھ بھیج دیا۔ جانے سے پہلے زمیندار نے مجھے بتایا کہ اُس نے مویشیوں والے مکان کے باہر بہرہ بٹھا دیا تھا تاکہ کوئی اندر نہ جاتے۔ یہ اُس نے چور کا گھرا (پاؤں کے نشان) محفوظ رکھنے کا اہتمام کیا تھا۔ اُس نے اپنے مکان تک آنے جانے والے راستوں پر بھی آدمی گھڑے کر دیتے تھے کہ ادھر سے کوئی نہ گزرے۔ میں نے اُس کی عقل کی تعریف کی اور میں نے اُس کے اس اقدام کی بھی تعریف کی کہ وہ وقت مناسب کتے بغیر میرے پاس آگیا تھا۔ لوگ نقب یا نقل کے موقعہ واردات پر پولیس کے آنے سے پہلے تماشہ دیکھنے کو ٹوٹ پڑتے ہیں اور مجرموں کے گھر سے تباہ کر دیتے ہیں۔

عثمان دو کانٹیلوں کو ساتھ لے کر اُس کے ساتھ چلا گیا۔ زمیندار کا گاؤں تقریباً دو میل دور تھا۔ سورج طلوع ہو رہا تھا۔ میں غسل اور ناشتہ وغیرہ کے لئے گھر چلا گیا۔ ایک گھوڑی کی چوری میرے لئے کوئی ایسی پیچیدہ اور اہم واردات نہیں تھی کہ میرا ذہن اس میں الجھ جاتا۔ مویشی

ایسے بچے میں مجھے دی جیسے اپنے کسی نوکر کو حکم دے رہا ہو کہ ابھی جاؤ اور میری گھوڑی واپس لے آؤ۔ میں اُس سے اپنے مطلب کی باتیں پوچھنے لگا۔ اُس کی گھوڑی صحن میں بندھی ہوتی تھی۔ بہرات وہیں باندھی جاتی تھی لیکن اُس روز علی الصبح گھوڑی وہاں نہیں تھی۔ یہ زمیندار جس عویلی میں رہتا تھا اس کے ساتھ مویشیوں کا مکان تھا۔ اس کا صحن اور دو فرانچ کمرے تھے۔ ایک نوکر صحن میں سوتا تھا۔ صحن کا دروازہ اندر سے بند ہوتا تھا۔ یہ نوکر اُس کے ساتھ تھانے میں آیا تھا۔ نوکر نے بتایا کہ سحر کی تاریکی میں اُسے بھینسیں دوہنے والے نوکر نے جگایا۔ اس سے پہلے وہ دروازہ کھٹکھٹایا کرتا اور نوکر اندر سے دروازہ کھولا کرتا تھا لیکن اُس روز نوکر نے اُسے اندر آکر جگایا تو اُس نے جگانے والے سے پوچھا کہ دروازہ کس نے کھولا ہے؟ اُسے دوسرے نوکر نے بتایا کہ دروازہ کھلا ہوا تھا۔ تب اس نے دیکھا کہ گھوڑی غائب ہے۔ ادھر ادھر دیکھا۔ گھوڑی نہ ملی۔ بھینسوں والے نوکر نے اُسے مشورہ دیا کہ مالک کو بتا دیا جاتے۔ ایسا ہی کیا گیا۔ زمیندار کو جگا کر بتایا گیا۔ اُس نے آکر دیکھا۔ پہلے تو نوکر کی پٹائی کی پھر اُسے تھانے چلے گئے۔ نوکر کو اچھی طرح یاد تھا کہ اُس نے رات دروازہ اندر سے بند کیا تھا۔ زمیندار کو یقین ہو گیا کہ گھوڑی چوری ہو گئی ہے۔ اُس نے مجھے گھوڑی کی وہ خوبیاں بتائیں جو میں آپ کو سننا چکا ہوں۔ میرے پوچھنے پر اُس نے بتایا کہ اُسے کسی پر شک نہیں۔ اُس نے گھوڑی کا رنگ بھی بتایا۔ اُس

انسانی گھروں میں اُس نے نوکر کا کھڑا پہچانا اور ان میں اُس نے چور کا کھڑا دیکھا۔ یہ دیہاتی جوئی کا کھڑا تھا۔

میں نے اپنی کہانیوں میں آپ کو کتنی بار بتایا ہے کہ مجرموں کے پاؤں کے نشان پہچاننا ایک مشکل فن ہے۔ اسے فن کی بجائے سائنس کہا جائے تو صحیح ہے۔ اسے کھڑا اٹھانا کہتے ہیں۔ کھوجی کھڑے کو پہچان لیتا ہے۔ اس کھڑے کا اگر کہیں ذرا سا نشان (ایڑی کا یا صرف پنچے کا) نظر آجائے تو کھوجی پہچان لیتا ہے۔ یہ کھوجی ان پڑھ دیہاتی ہوتے ہیں۔ کھڑا اٹھاتے اٹھاتے کہیں کھڑا گم ہو جاتے تو آخری پاؤں کے نشان کی سمت دیکھ کر وہ دُور آگے، کہیں نہ کہیں، یہ کھڑا کچھ پلٹے اور اکثر چور کے گھریا جہاں کہیں وہ گیا ہو پہنچ جاتے ہیں۔ راماکھوجی اُس وقت پچاس سال کی عمر کا ماہر کھوجی تھا۔ اُس نے گھوڑی اور چور کا کھڑا اٹھایا اور گاؤں سے باہر ایک جگہ رک کر اُس نے زمین کو غور سے دیکھا اور عثمان کو بتایا کہ گھوڑی کے ساتھ ایک آدمی ہے جو گھوڑی سے آگے چلتا آیا ہے۔ یہاں ایک اور آدمی کھڑا تھا۔ گھوڑی رُکی اور ان دونوں میں سے ایک آدمی گھوڑی پر سوار ہو گیا ہے۔

اُس نے اس سے آگے کھڑا اٹھایا۔ اُس کے کہنے کے مطابق گھوڑی پر ایک آدمی سوار تھا اور دوسرا آدمی اُس کے ساتھ ساتھ چلا جا رہا تھا۔ گھوڑی پر زین نہیں ہو سکتی تھی۔ زمیندار نے میرے پوچھنے پر بتایا تھا کہ زین اُس کے گھر میں رکھی تھی۔ گاؤں سے تقریباً دو فرلانگ دُور

چوری ہوتے ہی رہتے تھے۔ میں نے اس گھوڑی کی چوری کے متعلق یہ راستے قائم کی تھی کہ اس زمیندار کو ایک گھوڑی منالے ہو جانے کا افسوس نہیں، اسے دراصل اس پر غصہ ہے کہ وہ اپنے علاقے کا بادشاہ ہے اور کوئی اُس کی گھوڑی لے گیا ہے۔ میں جب غسل اور ناشتے سے فارغ ہو کر اور وردی پہن کر مٹھانے میں آیا تو مجھے کسی کام کے لئے عثمان کی ضرورت محسوس ہوئی۔ تب مجھے خیال آیا کہ اُسے تو میں نے ایک گھوڑی کی چوری کی تحقیقات کے لئے بھیجا ہے۔ یہ واردات میرے لئے اتنی معمولی تھی کہ ایک گھنٹے بعد میرے ذہن سے اُتر گئی مگر یہ چھوٹی سی واردات تفتیش کے دوران جرم و جاسوسی کا ایسا خطرناک ڈرامہ بن گئی جو مجھے اور عثمان کو موت کے منہ میں لے گئی۔

## عورت کہاں سے آگئی ؟

بارہ بجے کے قریب ایک کانٹیل جو عثمان کے ساتھ گیا تھا واپس آگیا۔ اُس نے کہا کہ مجھے عثمان گاؤں میں بلاتا ہے۔ کانٹیل نے بلانے کی وجہ بتائی تو میں نے چار کانٹیل ساتھ لے لئے اور کانٹیل کے ساتھ چل پڑا۔ راستے میں کانٹیل نے مجھے بتایا کہ گھوڑی کے مالک نے عین میں اور باہر کھڑے رکھنے کا بڑا اچھا انتظام کر رکھا تھا۔ راماکھوجی عثمان کے ساتھ اندر گیا۔ اُس نے گھوڑی کا کھڑا پہچانا۔

اور نوکروں چاکروں کے تھے۔ مزار کے ارد گرد باغیچہ تھا۔  
 راتے کھوجی لے عورت کا کھڑا اٹھایا۔ وہ اس بستی سے آ رہی تھی۔  
 وہ جگہ جہاں گھوڑی رکھی، اس سے سوار اُترا اور اس پر ایک عورت  
 سوار ہوتی تھی پیر حکیم صاحب کے مکان کے پھوپھو اڑے کی طرف تھی۔  
 عورت کا کھڑا پیر کے مکان کے پھوپھو اڑے تک چلا گیا۔ تماشا کی اکٹھے  
 ہو گئے تھے۔ انہیں دُور بٹا دیا گیا۔ کھڑا پھوپھو اڑے کی دیوار کے ساتھ  
 سے شروع ہوا تھا۔ کھوجی نے دیوار کو غور سے دیکھا۔ دیوار پر رگڑ  
 کے نشان تھے۔ اُس نے کہا ”عورت اوپر سے نیچی چھت سے  
 نیچے آتی ہے۔ نیچے آنے کا ذریعہ رستہ ہو سکتا ہے۔“ لیکن وہاں کوئی  
 رستہ نہیں لٹک رہا تھا۔ اُناں لیا گیا ہوگا۔ میں نے جاکر وہ جگہ دیکھی تو  
 میری بھی یہی رائے تھی کہ رستہ اوپر باندھ کر لٹکا یا گیا اور عورت رستے  
 کو پکڑ کر اور پاؤں دیوار پر رکھتی نیچے آتی۔ جہاں وہ زمین پر آتی وہاں  
 اُس کے کھڑے صاف بتاتے تھے کہ اس کا منہ پہلے دیوار کی طرف  
 تھا، پھر وہ پیچھے کو مڑی اور چل پڑی۔ اُس کے کھڑے اُس جگہ تک  
 گئے جہاں گھوڑی رکھی تھی۔ وہاں سے کھڑے غائب ہو گئے۔ اس کا مطلب  
 یہ تھا کہ عورت گھوڑی پر سوار ہو گئی اور گھوڑی اُسے نامعلوم منزل کو  
 لے گئی۔ وہاں سے گھوڑی کے کھڑوں کے ساتھ دو آدمیوں کے کھڑے  
 شروع ہوئے۔ صاف ظاہر تھا کہ عورت پیر حکیم صاحب کے گھر سے  
 نراہ ہوتی ہے۔ لہذا اس کے گھر کے افراد کو شامل تفتیش کرنا ضروری تھا۔

سے گھوڑی اور ایک آدمی کے کھڑے ایک جگہ جاکر رُک گئے۔ کھوجی  
 نے زمین پر بیٹھ کر زمین سے بھید لیا اور بتایا۔ ”جو آدمی گھوڑی پر سوار  
 تھا گھوڑی سے اُتر آیا ہے اور یہاں ایک اور کھڑا شامل ہو گیا ہے جو  
 عورت کا ہے۔ یہاں عورت گھوڑی پر سوار ہو گئی ہے۔“ پھر وہ دیکھنے لگا  
 کہ عورت کدھر سے آتی ہے۔

وہاں سے دُیر طہ ایک فرلانگ کے فاصلے پر ایک آبادی تھی۔  
 وادرات والے گاؤں سے اس آبادی کا فاصلہ دو فرلانگ کے لگ بھگ  
 تھا۔ یہ اس علاقے کے پیر صاحب کی آبادی تھی۔ اس پیر کو لوگ پیر حکیم  
 صاحب کہتے تھے کیونکہ وہ تعویذوں اور دعاؤں کے ساتھ دوائیں بھی  
 دیا کرتا تھا۔ مسلمان اُس سے تعویذ اور دوائیں لیتے، ہندو اور سکھ اس  
 سے دوائیں لیتے تھے۔ یہ پیر حکیم صاحب ”بے اولاد عورتوں کو اولاد“  
 دیتا اور مشہور تھا کہ اُس کا دادا سردے میں جان ڈال دیا کرتا تھا۔  
 قابل غور امر یہ ہے کہ یہ پیر (اولاد دینے والے ہر پیر کی طرح)  
 بے اولاد صرف عورت ذات کو سمجھتا تھا خاندان کو نہیں۔ لہذا صرف  
 عورت کو اپنے پاس بُڑاتا تھا۔ اُس کی شہرت دُور دُور تک تھی۔ ہندو  
 اور سکھ عورتیں بھی اُس کے پاس تعویذ وغیرہ لینے جایا کرتی تھیں۔  
 چالیس کے لگ بھگ اُس کی عمر تھی۔ اُس کی زبان میں جادو تھا۔ اس  
 چوٹی سی بستی میں اُس کے باپ دادا کا مزار تھا۔ اس کے ساتھ اُس کا  
 مکان تھا۔ اس کے ساتھ نو دس کچے مکان تھے جو اُس کے خصوصی مریدوں

## عورت رے سے اُتری تھی

میں کانٹیل کے ساتھ اُس جگہ کی طرف جا رہا تھا۔ وہ مجھے کھڑا اٹھانے اور کھڑے پیر حکیم صاحب کے پھوپھو اُسے پہننے تک کی روایت دینا رہا تھا۔ ہم دونوں پیر کی بستی تک پہنچ گئے۔ عثمان غنی اور تذبذب کی مالت میں میرا انتظار کر رہا تھا۔ عثمان کے متعلق میں نے آپ کو پہلے کسی لہانی میں بتایا تھا کہ رام پور کے اعلیٰ خاندان کا جوان اور خوب رو آدمی تھا جسے پھر تپلا اور وہ زندہ دل تھا۔ جس کیس میں کوئی خوبصورت اور شوخ لڑکی شامل ہو تو اس کیس کی تفتیش وہ اپنے ہاتھ میں لینے کی کوشش کیا کرتا تھا۔ اُسے رشوت سے نہیں خریدوا جاسکتا تھا۔ وہ امیر خاندان کا فرد تھا۔ اُس کا باپ اُسے پولیس کا بہت بڑا افسر بنانا چاہتا تھا۔ اگر وہ زندہ رہتا تو پولیس کا سب سے بڑا افسر بنتا۔ اُس میں تمام خوبیاں اور اہمیت موجود تھی لیکن میرے لئے اُس نے اپنی جان قربان کر دی۔ میں ابھی تک ہر سال اُس کے یوم وفات پر اُس کے لئے وُرد اور فاتحہ پڑھا کرتا ہوں۔

وہ پیر حکیم صاحب کی بستی سے ذرا ہٹ کر کھڑا تھا۔ کھوجی، ایک کانٹیل اور گھوڑی کا مالک زمیندار اُس کے پاس کھڑے تھے۔ تفتیش لڑکی ہوتی تھی۔ عثمان نے مجھے کھڑوں کی وہی تفصیل سنائی جو کانٹیل بچے

مجھے اس عورت کے بھاگ جانے کے ساتھ کوئی دلچسپی نہیں ہونی چاہیے تھی کیونکہ میرے پاس اس کی گمشدگی کی رپورٹ نہیں آتی تھی۔ میری دلچسپی گھوڑی کے ساتھ تھی۔ اتفاق سے (یا مجرموں کے پروگرام کے مطابق) عورت کے کھڑے گھوڑی سے جا ملے تو میرے لئے ضروری ہو گیا کہ معلوم کروں کہ یہ عورت کون تھی اور کس کے ساتھ گئی ہے کسی پیر کے گھر سے کسی عورت کا فرار میرے لئے ایسا واقعہ نہیں تھا کہ میں حیران ہوتا یا میں چونکا اُٹھتا۔ ان پیروں کی اندرونی دنیا پیر اسرار ہوتی ہے۔ انہی اسرار کو لوگ مرشد کی کرامت کہتے ہیں مگر یہ جراثیم اور گناہوں کی دنیا نے جسے کسی روشن خیال پولیس افسر کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ پیروں کے گھروں میں کسی عورت کی قید اور فرار کوئی الوکھا واقعہ نہیں ہوتا۔ یہ پیر حکیم صاحب ”اولاد دینے والا“ پیر تھا۔ اُس نے کسی بے اولاد عورت کو اولاد کا بھانہ دے کر گھر میں رکھ لیا ہو گا اور وہ موقع پا کر نکل بھاگی ہوگی۔

”لیکن وہ زمیندار کی گھوڑی پر کیوں گئی؟“ میں نے سوچا۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ زمیندار نے ہی اس عورت کو فرار کرایا ہو۔۔۔ اگر ایسا ہی تھا تو اُس نے گھوڑی کی چوری کی رپورٹ کیوں دی؟ اُس کے کہنے کے مطابق، گھوڑی زین کے بغیر گئی تھی۔

عثمان ایک ذہین پولیس افسر تھا۔ اس واردات میں اُس نے یقیناً کوئی اہم بات معلوم کی ہوگی۔ اسی لیے اُس نے مجھے بلالیا تھا۔

آدمی بھی نہیں تھا، لیکن وہ اندر کی مستورات کے خیال سے اندر نہ گیا اور مجھے بلالیا۔ میں ان "سرکاروں" کے معاملے میں پورا کافر تھا۔ وہاں زمیندار موجود تھا جو سرکاری طور پر سفید پوش تھا۔ نمبر دار اور چوکیدار کو بھی بلالیا اور دروازہ کھلو کر اندر چلا گیا۔

مجھے احساس تھا کہ ایک پیر کے گھر میں زبردستی داخل ہونے کا نتیجہ کیا ہوگا۔ بڑے بڑے جاگیردار اور انگریزوں کے پروردہ سرکردہ مسلمان بھی اس پیر کے مرید تھے۔ یہ سب میرے خلاف طوفان کھڑا کر سکتے تھے۔ انگریز افسروں نے یہ اصول بنا رکھا تھا کہ وہ کسی کے مذہب، عبادت گاہوں اور توہمات، پنڈتوں، پیروں وغیرہ میں دخل اندازی نہیں کرتے کرتے تھے۔ اس سے آپ یہ نہ سمجھیں کہ وہ ہندوستانیوں کے مذہبوں اور مذہبی پیشواؤں کا احترام کرتے تھے۔ وہ دراصل اس دکھاوے کے احترام سے مذہبی پیشواؤں کی حمایت حاصل کرتے رکھتے تھے۔ وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ مسلمانوں کے پیر اور ہندوؤں کے سادھو اور ان کے ٹوٹے ٹوٹے فراڈ کے سوا کچھ بھی نہیں اور ان کا کاروبار صرف اس لئے چمک رہا ہے کہ لوگ جاہل اور پسماندہ ہیں۔ اس لحاظ سے انگریز ہندوستان کے دیہاتیوں کو افریقہ کے جیشیوں سے تشبیہ دیا کرتے تھے۔

مجھے احساس تھا کہ میں پیر کی غیر حاضری میں اس کے گھر میں داخل ہو کر غلطی کر رہا ہوں اور فرض کی ادائیگی مجھے کسی مصیبت میں ڈال سکتی

راستے میں سنا چکا تھا۔ میں نے پیر کے مکان کے پھوٹے سے جا کر زمین پر عورت کے کھڑے دیکھے۔ دیوار پر خیموں کی رگڑ کے نشان دیکھے۔ اس میں کوئی شک نہ رہا کہ زمین پر کھڑے عورت کے ہیں۔ عثمان مجھے بلانے کی ضرورت محسوس نہیں کر رہا تھا۔ اُس نے پیر کے خصوصی مریدوں یا درباریوں میں سے کسی سے کہا کہ وہ پیر صاحب سے ملنا چاہتا ہے۔ عثمان کو بتایا گیا کہ پیر صاحب رات کو گھر میں ہی تھے، صبح سویرے کہیں چلے گئے ہیں۔

"میں اُوپر جاؤں گا" عثمان نے اس آدمی سے کہا۔ "گھر والوں سے کہو کہ پردہ کر لیں۔"

"مجھے گناہگار نہ کریں۔" پیر حکیم صاحب کے اس درباری یا نوکر نے عثمان سے کہا۔ "سرکار (پیر صاحب) کی غیر حاضری میں فرشتے اور جنات بھی اس گھر میں داخل نہیں ہو سکتے۔"

عثمان بھی جنات کی نسل سے تھا۔ اُس نے غصے سے دروازے پر دستک دی۔ اندر سے ایک نوکرانی نکلی۔ عثمان نے اُسے کہا کہ اندر پردہ کراؤ، میں اُوپر جاؤں گا۔ نوکرانی اندر چلی گئی اور اندر سے وہی جواب لاتی جو عثمان کو پیر کا ایک آدمی دے چکا تھا۔ اتنے میں "سرکار کے دربار" کے چند اور آدمی آگئے۔ انہوں نے عثمان کو اس درگاہ اور سرکار کے تہ سے ڈرایا اور مشورہ دیا۔ "سرکار کو آنے دیں"۔ عثمان وقت ضائع کرنے کے نقصان سے آگاہ تھا اور وہ "سرکار" سے ڈرنے والا

جاؤں گا۔“

”ملک صاحب! اسی کو راسے کے ساتھ جانے دیں۔“ عثمان نے ہنس کر کہا۔ ”یہ تھانیداری کی امید لگاتے بیٹھا ہے۔ میں نے تھانے سے چلتے وقت دو کانٹیلوں کو بلایا تو یہ دوڑا آیا اور بولا، میں آپ کے ساتھ جاؤں گا۔ اسے تعیش کی پرسکٹس کرنے دیں۔“

گھوڑی عاتب ہوتی یا عورت؟

اشرف علی راسے کھوجی کے ساتھ ہو گیا اور میں تھانے کو چل پڑا۔ زمیندار نے مجھ سے پوچھنے کی بجائے مجھے کہا۔ ”میں گھر جا رہا ہوں۔ گھوڑی کا کچھ پتہ چلے تو مجھے بلالینا۔“

”جناب! میں نے اُسے کہا۔“ آپ کو میرے ساتھ رہنا پڑے گا۔ مجھے ابھی آپ کی ضرورت ہے۔“

وہ بادل نخواستہ میرے ساتھ چل پڑا۔ مجھے کچھ ایسا شک ہونے لگا تھا کہ پیر کے گھر سے عورت اسی نے فراہم یا خواہاں کی ہے اور اُسے اپنی گھوڑی پر کہیں بھیج دیا ہے۔ اس نے اتنی سویرے گھوڑی کی رپورٹ دے دی تھی۔ اس میں کوئی راز تھا۔ اس کے کوئی ڈرامہ بنایا ہو گا۔ میرا شک غلط ہو سکتا تھا۔ میرے سامنے ایک اور پس منظر بھی تھا۔ وہ یہ کہ علاقے کے پیر اور علاقے کے جاگیردار کی آپس میں

ہے مگر میری طبیعت کے اکھڑپن اور ضدی پن نے مجھے مجبور کر دیا تھا۔ یہ وجہ بھی تھی کہ میں پیری مزیدی کے خلاف تھا۔ میں قرآن اور رسول خدا کا مرید ہوں۔ میں چار کانٹیل اس لئے اپنے ساتھ لایا تھا کہ کوئی گڑبڑ بھی ہو سکتی تھی۔ ہندو عوام میرے خلاف ہو جایا کرتے تھے اور میں ان کا مقابلہ بھی کیا کرتا تھا مگر اپنے مسلمان پیر پرست بھائیوں پر مجھے ذرہ بھر بھروسہ نہیں تھا۔ بہر حال میں نے خطرہ منول لیا۔ سیڑھیوں سے اُوپر گیا۔ چھت ٹٹی والی تھی۔ لیپ پڑا تھا۔ کھوجی نے وہاں بھی عورت کا کھڑا ڈھونڈ لیا۔ منڈیر پر رستے کا نشان معلوم ہوتا تھا۔ وہاں منڈیر سے ہٹ کر ایک گمبھی تھی۔ رستے کا اوپر والا سرا وہاں باندھا گیا ہو گا۔

میں نے اور کھوجی نے چھت اور منڈیر پر نشان دیکھنے کی کوشش کی۔ یہ یقین ہو چکا تھا کہ اُوپر سے کوئی نیچے گیا ہے۔ اسے کھوجی عورت کہہ رہا تھا۔ میں نے پیر حکیم صاحب کے درباری مریدوں اور نوکرانوں میں سے چار کا انتخاب کیا اور انہیں دو کانٹیلوں کے ساتھ تھانے بھیج دیا۔ میں نے گھر کی مستورات سے بات کرنے کی جرأت نہ کی۔ کھوجی کو میں اُس جگہ لے گیا جہاں اُس کے بتانے کے مطابق گھوڑی رُکی اور اُس پر لڑکی سوار ہوئی تھی۔ میرے پوچھنے پر اُس نے بتایا کہ گھر سے صاف بیٹن اور وہ آگے جاتے گا میں نے اُسے کہا کہ ایک کانٹیل کو ساتھ لو اور جہاں تک کھڑا تھا ہے جاؤ۔ جو دو کانٹیل عثمان کے ساتھ آتے تھے اُن میں ایک اشرف علی تھا۔ اُس نے کہا۔ ”میں راسے کے ساتھ

مولہ شیوں کی چوری کی دو وجوہات ہوتی ہیں۔ ایک تو یہ پیسہ کمانے کا ذریعہ ہوتا ہے۔ چوری کے مولہ شی خریدنے والے مجرم قسم کے لوگ ہوتے ہیں۔ دیہات میں مولہ شی، خصوصاً کسی کا گھوڑا چوری کرنے یا کرانے کی ایک وجہ دشمنی بھی ہوتی ہے۔ دیرینہ دشمنی کی بنا پر ایک دوسرے کے گھلیان جلا دیتے جاتے اور مولہ شی چوری کر کے غائب کر دیتے جاتے ہیں۔ اُس دور میں یہ بھی ہوتا تھا کہ گھوڑا گھوڑی یا کوئی اعلیٰ نسل کا مولہ شی چوری ہو جاتے تو اسے سخت بے عزتی سمجھا جاتا تھا۔ مجھے یہ بھی شک تھا کہ زمیندار کو بے عزت کرنے کے لئے اُس کی اچھی گھوڑی کھدواتی گئی، مگر کوئی بھی شک ذہن میں آتا تو اس مقام پر شک ہوا میں اُڑ جاتا جہاں گھوڑی کے کھرے میں ایک عورت کا کھڑا شامل ہو گیا تھا اور یہ کھڑا چیت سے دیوار کے ساتھ نیچے آتا تھا مجھے اس سے اطمینان ہوتا تھا کہ راما کھوجی اور کانٹیل اشرف علی کھڑا ٹھکانے

اُس بنا پر مجھے شک ہوا کہ پیر حکیم صاحب اور اس زمیندار کی عداوت ہوگی اور اس عداوت کی وجہ یہ عورت ہو سکتی ہے جو پیر کے گھر سے فرار ہوئی یا فرار کرائی گئی ہے اور گھوڑی چوری نہیں ہوئی بلکہ اُس نے خود کھلوائی ہے اور یہ اس ڈرامے کی ایک جعلی کڑی ہے ....  
تھانے جا کر میں نے اُس سے پوچھا کہ وہ عورت کون ہو سکتی ہے جو پیر کے گھر سے گئی ہے؟

”اُس کے گھر میں عورتوں کی کئی تو نہیں۔“ اُس نے جواب دیا۔  
 ”میں کیسے بتا سکتا ہوں کہ کون سی بھاگی ہے؟ کیا آپ نہیں جانتے کہ  
 اُس کے ہاں عورتیں اولاد کی مُراد لے کے جاتی رہتی ہیں؟ ان میں  
 سے کسی کو اُس نے گھر میں روک لیا ہوگا اور وہ بھاگ نکلی ہوگی۔“  
 ”آپ اس کے مُرد نہیں؟ میں نے پوچھا۔  
 ”میں ایسے نوکر باز اور بدکار کا مُرد نہیں بنوں گا۔“  
 اُس نے کہا۔



آگے چلے گئے تھے۔

نیلی آنکھوں والی لڑکی — ایک بھید

پیر حکیم صاحب کے جن چار آدمیوں کو میں ساتھ لایا تھا انہیں باری باری اپنے دفتر میں بلایا۔ زمیندار کو گھر جانے کی اجازت دے دی اور اُسے کہا کہ وہ اپنے ذرائع سے بھی گھوڑی کا کھوج لگانے کی کوشش کرے۔ پیر کے چار میں سے دو آدمیوں کو اندر کی باتوں کا کچھ بھی علم نہیں تھا۔ باقی دو میں سے ایک کو کچھ نہ کچھ معلوم تھا لیکن وہ ذرا سخت معلوم ہوتا تھا۔ اُس نے پردہ پوشی کی کوشش کی۔ اُسے یہ خوش فہمی تھی کہ میں پیر کے تقدس اور رعب سے مرعوب ہو کر اُسے پریشان نہیں کروں گا۔ میں نے تھوڑی سی دیر میں اُس پر پولیس کا ”تقدس“ اور اپنا رعب طاری کر دیا۔ اُس نے میرے آگے ہاتھ جوڑ کر التجا کی کہ میں کسی کو یہ نہ بتاؤں کہ اُس نے مجھے کچھ بتایا ہے۔

اُس نے بتایا کہ آٹھ دس دن گزرے ایک گورے رنگ اور نیلی آنکھوں والی لڑکی پیر کے ہاں آتی تھی۔ اس آدمی کو یہ معلوم نہیں تھا کہ وہ کہاں سے آتی تھی۔ اُس نے لڑکی کو پہلے روز ہی دیکھا تھا۔ اسے یہ معلوم تھا کہ لڑکی گنتی نہیں، پیر کے گھر میں ہی ہے۔ آٹھ دس روز بعد (واردات کی صبح) یہ آدمی پیر کے لوگوں کے کمرے میں سویا ہوا تھا۔

اُسے بستی کے ایک آدمی نے جگا کر بتایا کہ پیر کے بھوپاڑے ایک رستہ تنگ رہا ہے۔ یہ آدمی دوڑتا گیا اور رستہ لٹکنا دیکھا۔ جج ابھی وحند لی تھی۔ اُس نے پیر کو اطلاع دی۔ پیر نے رستہ اُتر دیا۔ وہ سخت غصے میں تھا۔ اُس نے گھوڑا تیار کرایا اور کہیں چلا گیا۔ اس آدمی کو پتہ چلا کہ گورے رنگ اور نیلی آنکھوں والی لڑکی بھاگ گئی ہے۔ اس آدمی نے مجھے بتایا کہ یہ آدمی جو باہر بیٹھا ہے بہت کچھ جانتا ہے۔ یہ پیر کا خاص آدمی تھا۔ میں نے چوتھے آدمی کو بلایا۔ اُس نے بھی مجھے گمراہ کرنے کی کوشش کی۔ میں نے اُسے پیٹ میں لے لیا۔ اُس نے یہاں تک رخصاندی کا اظہار کر دیا کہ وہ اس کیس میں میرے لئے مخبری کرے گا۔ میں نے اُسے بتایا کہ وہ صبح مخبری کرے گا تو اُسے معقول انعام ملے گا۔ اُس نے ایک تکاؤں کا نام لے کر بتایا کہ لڑکی وہاں کی رہنے والی ہے اور غریب ماں باپ کی بیٹی ہے۔

”مگر میں مان نہیں سکتا کہ یہ لڑکی اس ماں اور اس باپ کی بیٹی ہے۔“ اُس نے کہا۔ ”ماں کا رنگ ذرا صاف گندمی ہے اور باپ کا لے رنگ کا ہے۔ یہ غریب کسان ہیں۔ ان کی بیٹی گورے رنگ اور نیلی آنکھوں والی نہیں ہو سکتی۔ بہت غلبہ صورت لڑکی ہے۔ مجھے یہ معلوم ہے کہ یہ غریب آدمی اپنی بیوی کو سرکار (پیر) کے پاس اولاد کے لئے لاکر آتا تھا۔ وہ کہتا تھا کہ یہ لڑکی اس کی واحد اولاد ہے۔ اس کے بعد کوئی بچہ پیدا نہیں ہوا۔ سرکار اُسے تعویذ دیتے تھے۔ سات آٹھ روز

گزرے یہ میاں بیوی اس لڑکی کو ساتھ لاتے۔ سرکار نے دیکھ کر کہا کہ یہ لڑکی انسان نہیں جن ہے جس نے اس عورت کے بطن سے جنم لیا ہے۔ پھر مجھے معلوم نہیں کہ علیحدگی میں سرکار نے ان کے ساتھ کیا باتیں کیں۔ ماں باپ لڑکی کو یہیں چھوڑ کر چلے گئے۔ میں سرکار کا خاص آدمی ہوں۔ ایک روز سرکار نے مجھے کہا کہ یہ لڑکی ان غریبوں کے گھر بھی نہیں لگتی۔ اب یہ ہمارے دربار میں رہے گی کیونکہ یہ جنات کی نسل سے ہے۔ ”میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ یہ میاں بیوی کسی اور کی بیٹی کو ورغلا کر یا اغوا کر کے سرکار کو خوش کرنے کے لئے آئے ہیں۔ یہ ان کی بیٹی ہو ہی نہیں سکتی۔ میں نے سرکار سے نہیں پوچھا کہ لڑکی کی اصلیت کیا ہے۔ آج صبح سرکار نے مجھے غصے سے جگایا اور گالیاں دے کر کہا کہ وہ غائب ہو گئی ہے۔ انہوں نے کہا کہ بد بخت جن بھتی ورنہ غائب نہ ہوتی۔ سرکار مجھے چھت پر لے گئے۔ وہاں مٹھی کے ساتھ رستہ بندھا ہوا تھا جو نیچے زمین تک چلا گیا تھا۔ لڑکی رستے سے ہی نیچے گئی ہوگی، بڑے دروازے سے وہ نہیں بھاگ سکتی کیونکہ ڈیوڑھی میں، میں اور میرے دو ساتھی سوتے ہوتے ہیں۔ سرکار نے رستہ غائب کر دیا اور مجھے سختی سے کہا کہ کسی کے ساتھ اس کا ذکر نہ ہو۔ پھر سرکار گھوڑے پر سوار ہو کر کہیں چلے گئے۔ بھوڑی دیر بعد پولیس آگئی۔

میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ میری دلچسپی لڑکی کے ساتھ نہیں گھوڑی کے ساتھ تھی کیونکہ میرے پاس رپورٹ گھوڑی کی چوری کی آتی تھی لڑکی

کی گمشدگی کی نہیں۔ رازے کھوجی نے مجھے اس پھر میں ڈال دیا تھا کہ پیر کی چھت سے ایک عورت اُتری اور چوری کی گھوڑی پر سوار ہوتی ہے۔ لہذا مجھے اس لڑکی کے متعلق سب کچھ معلوم کرنا پڑا۔ میں نے پیر کے اس خاص آدمی سے پوچھا کہ لڑکی زمیندار کی گھوڑی پر کیوں گئی ہے؟ اُس نے کہا کہ اس کے متعلق اُسے کچھ بھی معلوم نہیں۔ البتہ اُسے یہ معلوم ہے کہ زمیندار اور پیر کی عداوت چلی آرہی ہے۔ عداوت کی وجہ یہ ہے کہ پیر ایک لڑکی پر ہاتھ صاف کر گیا تھا جسے زمیندار اپنی زر خرید لوٹائی تھا تھا۔ اُس نے بتایا کہ یہ لڑکی اونچی ذات کی مسلمان ہے اور اب کسی اور کی بیوی ہے۔

”پھر اس نیلی آنکھوں والی لڑکی پر دونوں کی عداوت پہلے سے زیادہ ہو گئی۔“ اُس نے بتایا۔ ”لیکن مجھے یہ معلوم نہیں کہ زمیندار اس لڑکی کو کہاں ملا اور اُن کے تعلقات گھر سے تھے یا نہیں۔“

”کہیں ایسا تو نہیں کہ پیر نے لڑکی کو کہیں آگے چلا دیا ہو؟ میں نے پوچھا۔“ اور زمیندار کی گھوڑی چوری کروا کے لڑکی کو اس پر بھیجا ہو؟

”نہیں۔“ اُس نے وثوق کے ساتھ جواب دیا۔ ”اگر سرکار ایسا کام کروا تے تو میرے ہاتھوں کے واسطے۔ اگر کسی اور سے کروا تے تو میرے ساتھ ضرور بات کرتے۔“

”تم کیوں یہ سبھی بیٹھے ہو کہ پیر ہر معاملے میں تمہارے ساتھ بات

ضرور کرتا ہے؟

ہے، مجھے دے دیں۔“

وہ عجیب طرح ہنسا اور بولا۔ ٹکیا پیر؟ کہاں کا پیر؟ لوگ اسے اس لئے سرکار کہتے ہیں کہ اسے خدا کا اپنی سمجھتے ہیں، اور میں اسے اس لئے سرکار کہتا ہوں کہ نو سر بازی کا استاد ہے اور میں اس کا شاگرد ہوں اس نے میری عیش و عشرت کا انتظام کر رکھا ہے۔ اس کے مکان پر تعویذوں کے ذریعے اولاد دینے کے پردے میں جو بدکاری ہو رہی ہے اس کا عینی شاہد صرف میں ہوں۔ لوگ بے غیرت ہیں جو اپنی عورتوں اور جوان لڑکیوں کو اس شخص کے گھر بھیجتے ہیں۔ مردے پر تو بھی شُدا نے بھی جان نہیں ڈالی لیکن لوگ اس جھوٹ کو سوجھ مانتے ہیں کہ اس پیر کے باپ دادا مردوں کو زندہ کیا کرتے تھے۔ اگر حکومت اس شخص کو اس گھر سے نکال دے تو یہ کسی مسجد میں نہیں جا بیٹھے گا، نہ جنگل میں جا کر اللہ اللہ کرے گا بلکہ ڈاکوؤں کے کسی گروہ سے جا ملے گا۔“

میں نے اس سے کچھ اور باتیں پوچھیں اور اُس کے ساتھ مخبری کا سودا کر کے اُسے اور اس کے ساتھیوں کو جانے کی اجازت دے دی۔ میں نے اسے۔ ایس۔ آئی عثمان کو بتایا کہ یہ آدمی مجھے اندر کی کیا کیا باتیں بتا گیا ہے۔ لڑکی کا ذکر آیا تو عثمان نے زندہ دلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ ”ملک صاحب! یہ تفتیش میرے سرور کر دیں۔ آپ کوئی اور کام کریں۔ نیلی آنکھوں والی لڑکی سے آپ کا کیا تعلق۔ بڑا گندہ کیس

۲۰۴

اُس کی زندہ دلی نے میری تھکن دُور کر دی۔ کچھ دیر اس سے ملتا ہوا ہنسی مذاق ہوتا رہا۔ میں نے اُسے لڑکی کے ماں باپ (اگر وہ واقعی اس کے ماں باپ تھے) کے گاؤں کا نام بتا کر کہا کہ وہ کل سورج نکلنے سے پہلے وہاں پہنچ جاتے اور انہیں تنہا لے آتے۔ لڑکی کے متعلق جی اُسے ضروری ہدایات دیں اور کہا۔ ”عثمان! لڑکی اگر ایسی ہی فیصورت ہے جیسی بتائی گئی ہے تو تم شریف باپ کے حلالی بیٹے کی طرح اسے میرے پاس لے آنا۔ اگر تم نے تفتیش خراب کی تو تمہیں گھر بھجوا دوں گا۔“

”یہی تو میری مجبوری ہے ملک صاحب!۔ اُس نے کہا۔ کہ میرا باپ شریف آدمی ہے۔ مجھے اُس کی عزت کی خاطر دل پر سچتر رکھنا پڑتا ہے۔“

## کھوجی قتل ہو گیا

سورج کبھی کا غروب ہو چکا تھا۔ میں نے عثمان سے کہا کہ چلو لہانا میرے ساتھ کھاؤ۔ ہم تنہا نے سے نکل رہے تھے جب عثمان نے مجھے یاد دلایا کہ اشرف علی کاشمیلی اور راماکھوجی ابھی تک واپس نہیں آئے۔ میں سناچکا ہوں کہ رائے کھوجی سے میں نے کہا تھا کہ گھوڑی

کا کھڑا جہاں تک جاتا ہے وہ وہاں تک چلا جاتے اور اگر مدد کی ضرورت ہو تو کسی قریبی گاؤں کے نمبردار، ذیلدار اور سفید پوش کے ہاں چلا جاتے۔ اشرف علی کانٹیل نے کہا تھا کہ وہ اس کے ساتھ جانا چاہتا ہے چنانچہ اسے رامے کے ساتھ بھیج دیا گیا تھا۔ عثمان نے مجھے یاد دلایا کہ وہ دونوں ابھی تک نہیں آئے تو میں یہ سمجھ کر پریشان نہ ہوا کہ شام کا کھانا کھانے کسی گاؤں میں رُک گئے ہوں گے۔ مجھے خوشی بھی ہوتی کہ اُن کے ابھی تک نہ آنے کی وجہ یہی ہو سکتی ہے کہ رامے کھوجی نے گھوڑی کا سراغ لگا لیا ہے اور میرے لئے اچھی خبر لاتے گا۔ اتنی زیادہ دیر کی کوتاہی وجہ نہیں ہو سکتی تھی۔

گھر پہنچ کر میں وردی اتار رہا تھا کہ دروازے پر بڑی زور سے دستک ہوتی اور اس کے ساتھ گھبراتی ہوئی آواز آتی۔ ”ملک صاحب! یہ ہسپتال محترمہ کانتی کمار کی آواز تھی۔ میں نے عثمان سے کہا۔ جہاں آیا اس کا فر کو اندر لے آنا۔ بات کچھ بھی نہیں ہوگی اور پیچھے پیچھے دوڑا آیا ہے۔“ وہ اکثر گھبرا گیا گھبرا یا رہا تھا۔

کانتی کمار اندر آیا تو اشرف علی کانٹیل بھی اُس کے ساتھ تھا۔ اُسے دیکھتے ہی میں نے پوچھا۔ ”شرف! اچھی خبر لاتے ہو نا؟“ ”نہیں ملک صاحب!“ اُس نے کہا اور دھڑام سے جا رہا پاتی پر بیٹھ گیا۔ تب میں نے لائٹین کی روشنی میں اُس کے چہرے کی گھبراہٹ دیکھی۔ بولا۔ ”بہت بُری خبر لایا ہوں۔“

”فوراً بولو۔ کیا ہو گیا ہے؟“  
 ”راما کھوجی قتل ہو گیا ہے۔“ اُس نے جواب دیا۔  
 ”کیا کہا؟“ میں نے حیرت سے پوچھا۔ ”راما کھوجی قتل کیا ہے؟“

”جی ملک صاحب!“ اُس نے کہا۔ ”معلوم نہیں اللہ نے مجھے اس طرح بچا لیا ہے۔ گھوڑی کا کھڑا ہمیں دُور تک لے گیا۔ صاف کھڑا تھا۔ اگے وہ علاقہ آگیا جو ذرا گہرائی میں ہے اور اس میں چٹانیں اور ٹیکڑیاں ہیں۔ آپ نے یہ علاقہ دیکھا ہے۔ وہاں کھڑا غائب ہو گیا۔ راما کھڑا ڈھونڈتا رہا۔ وہ کہتا تھا کہ گھوڑی یہاں سے ضرور گزری ہے۔ راما ایک جگہ بیٹھ لیا اور سر جھکا کر زمین کو دیکھنے لگا۔ میں بھی اس سے آٹھ دس قدم دُور زمین پر کھڑا ڈھونڈ رہا تھا۔ مجھے زمین پر کچھ بھی نظر نہ آیا تو میں نے راسے کی طرف دیکھا۔ مجھے چار آدمی دکھائی دیتے جن کے چہرے اور سر پگڑیوں میں لپٹے ہوئے تھے۔ اُن کے ہاتھوں میں ہمارے لالٹھیل جتنے موٹے ڈنڈے تھے۔ میں سمجھا وہ کہیں جا رہے ہیں۔ مجھے معلوم نہیں وہ جھاڑیوں کے پیچھے چھپے ہوئے تھے یا کہاں سے اچانک ہی آگئے تھے۔ راما اچھلی نک بیٹھا زمین پر کوئی کھرا دیکھ رہا تھا۔۔۔“

”ان آدمیوں نے راسے کھوجی پر ڈنڈے برسائے شروع کر دیتے۔ راما آٹھ نہیں سکا۔ ان میں سے کسی نے میری طرف دیکھ کر کہا۔“ اُسے بھی ختم کر د اور دونوں کی لاشیں اٹھا لے چلو۔ میرے پاس

پر اعتبار کیا۔ اُس نے یقین دلادیا کہ رانا کھوجی مارا جا چکا ہے اور اُس کی لاش وہاں نہیں ہوگی۔ رات کے وقت موقعہ واردات پر جاننا مناسب نہیں تھا کیونکہ خطرہ تھا کہ یہ کسی منظم گروہ کی واردات ہے اور یہ گروہ رات کو مجھے گھات میں لے سکتا ہے۔ میں جان گیا کہ گھوڑی کی چوری اور پیر کے گھر سے لڑکی کا فرار یا اغوا ایک ہی واردات کی دو کڑیاں ہیں اور یہ پیشہ ور مجرموں کی واردات ہے۔ کھوجی اور کانٹیل پر حملہ اس کا ثبوت تھا کہ اس گروہ نے تماشائیوں کے روپ میں اپنے آدمی میرے ساتھ لگا رکھے تھے۔ مجھ سے یہ غلطی ہوتی کہ میں نے کھوجی کی حفاظت کے لئے زیادہ کانٹیل نہ بھیجے۔ میں نے جو کانٹیل بھیجا وہ غیر مستعد تھا۔ اُس کی پیٹی کے ساتھ بندھا ہوا پولیس کا چھوٹا سا ڈنڈا تھا جسے بیٹن کسا کرتے تھے۔

میں چونکہ اس واردات کو ایک گھوڑی کی چوری کی معمولی سی واردات سمجھ رہا تھا اس لئے ادھر دھیان ہی نہ گیا کہ کوئی جراثیم پیشہ گروہ سرگرم ہے۔ راسے کھوجی کے قاتل اسی گروہ کے ہو سکتے تھے۔ انہوں نے دیکھا ہوگا کہ کھوجی کھڑا اٹھتا سمجھ سمجھتا ہمارے تو انہوں نے اُس دیرانے میں گھات لگائی اور کھوجی اور کانٹیل کو ختم کرنے کی کوشش کی۔ کانٹیل خوش قسمت تھا کہ زندہ بچا۔ اُن میں اُس جگہ کو جانتا تھا۔ دیرانہ تھا۔ وہ جگہ قتل، تعاقب اور فرار کے لئے موزوں تھی۔

گھوڑی کی چوری ایک پراسرار اور سنگین واردات بن گئی۔ میں

یہ چھوٹا سا ڈنڈا تھا۔ اس سے میں چار آدمیوں کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔ میں بھاگ اُٹھا۔ ان میں سے دو آدمی میرے پیچھے دوڑے۔ میں اپنے تھانے کا رخ کرنے کی بجائے کسی اور طرف ہولیا۔ انہوں نے میرا راستہ روکنے کے لئے راستہ بدل دیا اور مجھے روک لیا۔ میں ایک چٹان پر چڑھ گیا اور دوسری طرف اُتر گیا۔ وہ ادھر آگئے۔ میں ایک طرف بھاگ اُٹھا۔ سورج غروب ہو گیا تو وہ واپس چلے گئے اور میں ایک گاؤں میں نمبردار کے گھر چلا گیا۔ اُسے سارا واقعہ سنایا۔ اُس نے مجھے کھانا کھلایا، پھر کلہاڑیوں سے مسلح چار آدمی اپنے ساتھ لے کر مجھے تھانے میں لے آیا۔ نمبردار اور یہ آدمی تھانے میں بیٹھے ہیں۔

”انہوں نے حملہ تقریباً کتنے بجے کیا ہوگا؟“ میں نے پوچھا۔  
”تین اور چار بجے کے درمیان۔“ اُس نے جواب دیا۔

## واردات — پراسرار اور سنگین

میں نے اُس کا بیان بہت مختصر کر کے سنایا ہے۔ اُس نے طویل تفصیل سنائی تھی۔ میں نے اور عثمان نے اس سے بہت کچھ پوچھا بھی تھا۔ اشرف علی قابل اعتماد کانٹیل تھا۔ میں اُسے عقل والا کانٹیل کہا کرتا تھا۔ اُس کی سروس نو دس سال ہو چکی تھی۔ اس کے خلاف کوئی ایسا بیوقوفی کی کبھی شکایت پیدا نہیں ہوئی تھی۔ اس سنگین واقعہ میں بھی میں نے اُس

نے اپنے مجرّم پولیس کے پیچھے لگا رکھے تھے۔

ان جرائم پیشہ گروہوں میں بعض فائدہ بخش قبائل تھے۔ ان کے مرد و عورتوں کی، ڈاکہ زنی اور رہزنی کو پیشہ بناتے ہوئے تھے اور ان کی عورتیں گھروں میں چوری چکامی اور عصمت فروشی کرتی تھیں میرے علاقے کے جو دواشتہاری مجرم، مینا اور بسا کھاتے ان کا تعلق ان فائدہ بخشوں کے ساتھ نہیں تھا۔ یہ دور دورہ ملک وارداتیں کرتے تھے۔ سرکاری کاغذات میں ان کی رہائش یا مستقل ٹھکانہ میرے علاقے میں لکھا ہوا تھا، اس لئے یہ میرے لئے مستقل دردِ سر بنے ہوتے تھے۔ وہ قتل اور ڈاکے کی متعدد وارداتوں میں مطلوب تھے۔ ہمارے لئے دشواری یہ تھی کہ ہمارے جو مجرم تھے وہ ان کے لئے بھی مجرمی کرتے تھے۔ یعنی یہ مجرم دو غلے تھے۔ جس گاؤں میں یہ مجرم عارضی قیام کرتے تھے اُس گاؤں کے لوگ بھی ان کی حفاظت کرتے تھے۔ اس کے بدلے میں یہ جرائم پیشہ گروہ اُس گاؤں کی عزت کو اپنی عزت سمجھتے اور اُسے ڈاکوؤں وغیرہ سے بچاتے رکھتے تھے۔ میں نے اور مجھ سے پہلے تحانیہ اوروں نے مجرموں کی اطلاع پر چھاپے مارے تھے لیکن مجرم دو غلے مجرمی سے فائدہ اٹھا کر ہر بار نکل جاتے تھے۔ ایک دوبارہ نازنگ کا تباہ لہ بھی ہوا تھا۔

اب ان میں سے کسی نے میرے ہی کھوجی کو قتل کروا دیا تھا۔ میں نے اپنے آپ کو یہ دھوکہ بھی دیا کہ شاید کھوجی کی اپنی برادری میں

نے عثمان سے کہا کہ وہ اشرف علی کے بیان پر رائے کھوجی کے قتل اور اشرف علی کو قتل کرنے کی نیت سے تعاقب کی ایف۔ آئی۔ آر تحریر کرے۔ وہ انگریزوں کا زمانہ تھا۔ کوئی تحانیہ ارکو تاہی اور ٹال مٹول کی جرات نہیں کرتا تھا۔ انگریز ڈی۔ ایس۔ پی اچانک دورے پر آتا اور پورا ریکارڈ دیکھتا تھا۔ انگریز ڈی۔ ایس۔ پی اپنے ہر تھانے کے علاقے میں بھی گھومنا کرتے اور زیرِ تفتیش کیسوں کی جانچ پڑتال بڑی باریکی اور سختی سے کیا کرتے تھے۔ مجھے اشرف علی نے یہ خبر سنا کر میری جھوک مار دی۔ غصہ آگیا تھا کھوجی کا قتل میرے لئے بہت بڑا چیلنج تھا۔

ان علاقوں میں دواشتہاری مجرم تھے۔ ایک مینا اور دوسرا بسا کھا۔ ان کے اپنے اپنے گروہ تھے۔ دونوں کا پیشہ رہزنی اور ڈکیتی تھا۔ اُس زمانے میں دیہاتی علاقوں میں آبادیاں کم اور ویرانے زیادہ تھے، اس لئے رہزنی کی وارداتیں زیادہ ہوتی تھیں۔ بڑے پیمانے کی ڈاکہ زنی بھی ہوتی تھی۔ ان گروہوں اور پولیس کی جنگ جاری رہتی تھی۔ کبھی آٹھ ساٹھ کا مقابلہ بھی ہو جاتا تھا۔ اکثر آنکھ مچولی جاری رہتی تھی۔ یہ گروہ واردات کر کے غائب ہو جاتے اور پولیس انہیں ڈھونڈتی پھرتی تھی۔ کبھی ان کا کوئی آدمی ہاتھ آجاتا تو پولیس اُسے زیادہ سے زیادہ سزا دلاتی تھی۔ کبھی پولیس کا کوئی ملازم ان کے ہاتھ چڑھ جاتا تو وہ اُسے ہمیشہ کے لئے غائب کر دیتے تھے۔ پولیس نے ان کی گرفتاری کے لئے اپنے مجرم پھیلا رکھے تھے اور ان جرائم پیشہ گروہوں

میں نہیں کرنا چاہتا تھا۔

مجھے یہ بھی توقع تھی کہ وہ خود ہی میرے پاس آئے گا، یا مجھے بلائے گا۔ میں نے اُس کی غیر حاضری میں اُس کے گھر میں داخل ہو کر اور اُس کی چھت پر جا کر تحقیقات کی تھی۔ کسی معمولی سے آدمی کے گھر پولیس چلی جاتے تو وہ بھی اسے اپنی بے عزتی سمجھتا تھا.... یہ تو پیر تھا جس نے اپنے آپ کو خدا کے بعد کا درجہ دے رکھا تھا۔ اس نے میری یہ گستاخی اور اپنی درگاہ کی بے ادبی برداشت نہیں کی ہوگی، لیکن اُس نے کسی ردِ عمل کا اظہار نہیں کیا تھا۔ ہو سکتا تھا کہ وہ گھر واپس نہ آیا ہو۔ یہ بھی ممکن تھا کہ وہ آگیا ہو۔ اُس کے آدمیوں نے مجھے بتایا تھا کہ وہ آ جاتے گا۔ ردِ عمل کا اظہار نہ کرنے کی اصل وجہ یہ تھی کہ اُس کے جس خاص آدمی نے مجھے نیلی آنکھوں والی لڑکی کا راز بتایا تھا، اُس کے ساتھ میں نے خاص قسم کی باتیں کی تھیں جو اس آدمی نے پیر کو بتا دی ہوں گی۔ اس آدمی نے پیر کو مشورہ دیا ہوگا کہ وہ دیک کے بیٹھا رہے۔

صبح ابھی پوری طرح روشن نہیں ہوئی تھی جب میں موقعِ واردات کو روانہ ہو گیا۔ میں نے کانٹیلینوں کی کچھ نفری ساتھ لے لی تھی۔ نصف نفری رانفلوں سے مسلح تھی۔ عثمان مین کانٹیل ساتھ لے کر نیلی آنکھوں والی لڑکی کے گاؤں کو روانہ ہو گیا۔ اُسے لڑکی کے ماں باپ کو تھانے لانا اور لڑکی کا سراغ بھی لگانا تھا۔

میں اشرف علی کی راہنمائی میں کھوجی کے قتل کی جگہ پہنچا۔ میں بتا

دشمنی ہوگی اور اسی کے نتیجے میں وہ قتل ہو گیا ہوگا۔ دوسرے دن میرا یہ شک یہ بتا کر رفع کروا گیا کہ مقتول کا کوئی دشمن نہیں تھا۔

## کھوجی کی صرف ہڈیاں ملیں

مجھے پیر حکیم صاحب کو شامل تفتیش کرنا تھا۔ مجھے اُسی وقت یعنی رات کو اُس کے پاس جانا چاہیے تھا۔ کھوجی کے قتل کے موقعِ واردات پر جانے کا میں فیصلہ کر چکا تھا کہ صبح جاؤں گا۔ رات منافع نہیں ہونی چاہیے تھی۔ گھوڑی کی چوری کی یہ واردات بڑا ہی سنگین جرم نظر آنے لگی تھی۔ میرے دماغ میں یہ فیضان آیا کہ کسی جہالت میں پیشہ گردہ نے گھوڑی چوری کی ہے اور لڑکی بھی اسی گردہ نے اغوا کی ہے۔ یہ اس گردہ کا سرغنہ ہو سکتا تھا جسے زمیندار کی گھوڑی بھی اچھی لگی تھی اور نیلی آنکھوں والی لڑکی بھی۔ مجھے اب ایک لمحہ بھی منافع نہیں کرنا چاہیے تھا۔ اب پیر کو شامل تفتیش کرنا پہلے سے زیادہ ضروری ہو گیا تھا لیکن میں نے رات کو اُس کے گھر جانا اس لئے مناسب نہ سمجھا کہ وہ شراب کے نشے میں بدست ہو گا۔ کوئی بات سمجھ نہیں سکے گا اور ڈھنگ کی کوئی بات نہیں کر سکے گا۔ میں اُسے تھانے بلا سکتا تھا لیکن اس خیال سے نہ بلایا کہ اُس نے پیری کے رُعب میں آنے سے انکار کر دیا تو مجھے اس کے خلاف کوئی سنگین کارروائی کرنی پڑے گی جو میں تفتیش کے اس مرحلے

گاہوں میں چلا گیا تھا وہ موقعہ واردات سے ڈیڑھ میل دور تھا۔ رائے کھوجی کی ہڈیاں اکٹھی کر وائیں۔ اُس کے دو بیٹے اور بیوی اطلاع ملنے پر وہاں آگئے تھے۔ اُن کا رونا میری برداشت سے باہر ہوا جا رہا تھا۔ جب اُس کا چھوٹا بیٹا جس کی عمر گیارہ بارہ سال تھی، روتا اور مجھے کہتا تھا۔ "میرے باپو کی ہڈیاں نہیں، میرا باپو زندہ ہے۔ کہاں ہے میرا باپو؟" تو میرے لئے برداشت کرنا مشکل ہو جاتا تھا۔ کھوج کے فن کے لحاظ سے رائے کو میں بھی اپنا باپو سمجھا کرتا تھا۔ میں نے ہڈیاں اکٹھی کر واکے مزدوری کاغذی کارروائی کی۔ گواہوں کے انگوٹھے گدوائے اور ہڈیاں ہسپتال بھجوا دیں جو بارہ میل دور قصبے میں تھا۔

میں زیادہ ہی جذباتی ہو گیا تھا۔ اس فزینی حالت میں فوراً نہ دیکھ سکا کہ وہاں خون کا ذرا سا بھی نشان نہیں تھا۔ میں نے اشرف علی سے کہا کہ یہاں خون نہیں ہے۔ اُس نے جواب دیا کہ انہوں نے مقتول کو ڈنڈوں سے مارا ہے اور کوئی تیز دھار ہتھیار استعمال نہیں کیا۔ لاش کی چونکے ہڈیاں رہ گئی تھیں اس لئے یہ دیکھنا ناممکن تھا کہ رائے کے جسم پر ضربیں کیسی تھیں۔ ڈنڈے کی ضرب سے عموماً خون نہیں نکلتا۔ کپٹی پر ایک ڈنڈا مقتول انسان کے ہاتھ سے لگ جاتے تو بعض انسان اسی سے مر جاتے ہیں۔

مجھے اب ڈاکٹر کی رپورٹ کا بھی انتظار کرنا تھا اور پیر حکیم صاحب کو بھی گھیرنا تھا۔ گھوڑی کی چوڑی کی معمولی سی واردات پیچیدہ ہو گئی تھی۔

چکاہوں کہ یہ جگہ گھات اور قتل کے لئے موزوں تھی۔ کانٹیل اشرف علی نے مجھے یقین دلایا تھا کہ کھوجی کی لاش وہاں نہیں ہوگی، لیکن لاش وہیں پڑی تھی۔ اگر مجھے معلوم نہ ہوتا کہ یہاں کھوجی قتل ہوا ہے تو میں کبھی نہ ماننا کہ رائے کھوجی کی لاش کی ہڈیاں ہیں۔ بھڑیہ بیل، بکڑ بکڑوں اور گیدڑوں نے سارا گوشت کھا لیا تھا۔ باقی جو کسر رہ گئی وہ گدے پوری کر رہے تھے۔ وہاں صرف ہڈیاں تھیں۔ کھوپڑی (سرا اور چہرے) پر کہیں کہیں کھال کا ٹکڑا نظر آتا تھا۔ آنکھیں نکالی جا چکی تھیں۔ جوتی، پکڑی اور کپڑوں کے ٹکڑوں سے شناخت کیا گیا کہ یہ رائے کھوجی کی لاش ہے۔ راما نیک انسان تھا۔ اپنے فن کا ماہر تھا۔ دیانتدار اتنا کہ دوبار مجرموں نے اُسے رشوت پیش کی اور کہا تھا کہ وہ پولیس کو گمراہ کرے۔ یہ رشوت اُس رقم سے بیس گنا زیادہ تھی جو اُسے پولیس سے ملتی تھی لیکن اُس نے رشوت قبول نہیں کی تھی۔ یہ اُس وقت کی دو وارداتیں تھیں جب میں اس محلے میں نہیں آیا تھا۔

ایسے آدمی کا یہ انجام دیکھ کر میرے آسٹونشک آتے۔ تھاندار جذباتی نہیں ہوا کرتے مگر میں جذباتی ہو گیا اور اشرف علی سے کہا۔ "شر فو! تم بھی اس کے ساتھ مر جاتے، اس کا ساتھ نہ چھوڑتے۔"

اشرف علی سے کہا کہ وہ جگہیں بتاتے جہاں کھوجی بیٹھا تھا اور جہاں وہ خود تھا۔ اُس نے رات کو سناٹی ہوئی کہانی پھر سناٹی اور مختلف جگہیں دکھائیں۔ میں نے اُس کے بھاگنے کا راستہ بھی دیکھا۔ وہ جس



## نیلی آنکھوں والی کس کی لڑکی تھی؟

نہیں، ان کی صرف گواہی کی ضرورت ہے۔ میں نے باپ کو اپنے دفتر میں بٹھایا۔ اُس کی بیوی کو باہر بٹھاتے رکھا۔ اس آدمی کی عمر چالیس سال سے اوپر ہو گئی تھی۔ میں نے اُسے تسلی تو بہت دی تھی لیکن تھلنے اور پوچھنے کی دہشت بہت بُری ہوتی ہے۔ یہ غریب آدمی تھا۔ میرے سامنے بیٹھے ہی اُس کے آنسو بہنے لگے، پھر بولا۔ سرکار (پیر حکیم صاحب) ٹھیک فرماتے تھے کہ یہ لڑکی جنات کی نسل سے ہے۔

”میں نے سنا ہے لڑکی بہت ہی خوبصورت تھی“ میں نے کہا۔

”میں تم سے قسم کھا کر وعدہ کرتا ہوں کہ تمہارے خلاف کوئی کارروائی نہیں کی جائے گی، مجھے یہ بتا دو کہ یہ لڑکی تمہیں کہاں سے ملی تھی؟“

”یہ میری اپنی لڑکی ہے حضور! اُس نے روتے ہوئے ہاتھ جوڑ کر جواب دیا۔ اسے میری بیوی نے جبل پور میں جنم دیا تھا۔ میں خود حیران ہوتا ہوں کہ ایسے رنگ اور آنکھوں والی لڑکی میرے گھر کیسے پیدا ہوئی۔ اس کا چہرہ اپنی ماں جیسا تھا۔ اس کی ماں اب تو سخت مزدوری کی وجہ سے مرجھا گئی ہے۔ جوانی میں اس کے نقش بہت اچھے تھے، لیکن لڑکی کی رنگت نہ میری ہے نہ اپنی ماں کی۔“

میرے چند ایک سوالوں کے بعد میرے کہنے پر اُس نے جو بیان دیا وہ مختصر اُس طرح تھا کہ لڑکی کی عمر ابھی پورے بیس سال نہیں ہوئی تھی۔ اس لڑکی کے بعد اس شخص کے گھر کوئی اولاد نہ ہوئی۔ اسے ایک بیٹے کی خواہش بھی تھی اور ضرورت بھی۔ اُس نے پیر حکیم صاحب

وہاں سے پیر حکیم صاحب کا گناہوں دو اڑھائی میل دور تھا۔ سوچا کہ پیر سے ملتا چلوں لیکن یاد آگیا کہ عثمان لڑکی کی ماں اور اُس کے باپ کو لے آیا ہو گا۔ پیر کے ہاں جانے کا ارادہ اس خیال سے بدل دیا کہ لڑکی کے والدین سے اُس کے متعلق یا اُس کے خلاف مواد اکٹھا کر لوں۔ میں تھانے گیا۔ عثمان انہیں لے آیا تھا۔ عثمان نے مجھے بتایا کہ ان دونوں کو معلوم نہیں کہ لڑکی کہاں ہے۔ یہ اُسے پیر کے گھر چھوڑ آتے تھے اور اس لڑکی کو یہ اپنی بیٹی کہتے ہیں۔ عثمان نے گاؤں سے یہ بھی معلوم کر لیا تھا کہ لڑکی کیسی ہے۔ اسے بتایا گیا کہ بہت خوبصورت لڑکی ہے اور اتنی ہی شیطان اور دلیر۔ عثمان نے جن تین چار آدمیوں سے لڑکی کے متعلق پوچھا تھا ان سب نے کہا تھا کہ وہ لڑکی کے گورے رنگ اور نیلی آنکھوں پر حیران ہیں۔ عثمان کو لڑکی کے متعلق ایک راتے یہ بھی ملی تھی کہ یہ ان میاں بیوی کی اولاد نہیں ہے۔ انہوں نے یہ لڑکی دودھ پینے کی عمر میں کہیں سے چرائی ہے۔ یہ دونوں اس گاؤں میں اُس وقت آکر آباد ہوتے تھے جب یہ لڑکی ڈیڑھ دو سال کی تھی۔

میں نے ان دونوں کو تسلی دلا سہ دیا اور بتایا کہ اُن پر کوئی الزام

پیسے دینے لگا۔ لڑکی بیچیزیں اور پیسے لے لیتی تھی۔ پھر لڑکی ایک رات باہر نکلی اور دو تین گھنٹوں بعد آئی۔ باپ نے پوچھا کہاں رہی؟ اُس نے بے رنجی سے گول گول سا جواب دیا۔ باپ لڑکی سے کچھ خائف رہتا تھا۔ اُس پر یہ خوف غالب تھا کہ لڑکی کسی کے ساتھ گھر سے بھاگ نہ جاتے۔ تین تین چار چار دنوں کے وقفے سے لڑکی تین بار راتوں کو باہر نکلی اور دیر سے گھر آئی۔ ماں باپ یہ سمجھ کر زمیندار رات کو آتا ہے اور لڑکی کہیں اُسے ملنے جاتی ہے۔ یہ غریب لوگ اتنے بڑے زمیندار پر اتنا بڑا الزام لگانے سے ڈرتے تھے۔ انہوں نے یہ بھی سوچا کہ اس زمیندار سے کہیں کہ لڑکی کے ساتھ باقاعدہ شادی کرنے کو وہ ڈرتے تھے کہ ایسا امیر کبیر آدمی ان غریبوں کی بیٹی کو قبول نہیں کرے گا۔ وہ تو لڑکی کو تفریح کا ذریعہ بنا رہا تھا۔

## پیر، زمیندار اور جنات

ایک روز زمیندار اُن کے گھر آیا تو ماں نے زمیندار سے کہہ بی دیا کہ وہ لڑکی کے ساتھ شادی کر لے۔ زمیندار نے بخوشی منظور کر لیا اور کہا کہ تم لوگ میرے پاس آ جاؤ، میں شادی کر لوں گا۔ اب باپ کے پاس زمیندار کے دیتے ہوتے پیسے آگئے تھے۔ ایک روز وہ اپنی بیوی کو ساتھ لے کر پیر حکیم صاحب کے دربار میں حاضر ہوا۔ اُس کے پاؤں

کی شہرت سُن رکھی تھی لیکن غربت کی وجہ سے "درگاہ" پر جانا نہیں تھا۔ نذرانے اور چڑھاوے کے لئے اُس کے پاس رقم نہیں تھی۔ واردات سے تین ساڑھے تین جھنڈے پہلے ایک امیر کبیر آدمی جو گھوڑے پر سوار تھا اُس کے گھر آیا اور اس لڑکی کے متعلق پوچھا کہ یہ تمہاری بیٹی ہے؟ باپ نے بتایا کہ یہ اُسی کی بیٹی ہے۔ اس آدمی نے اُسے کہا کہ وہ اُس کے گاؤں چلا چلے جہاں وہ اُسے کچھ زمین اور رہنے کو مکان دے دے گا۔ باپ سمجھ گیا کہ اس آدمی کی نظر اُس کی بیٹی پر ہے۔ اُس نے کہا کہ وہ بٹانی پر کسی کی زمین کاشت کرتا ہے۔ یہ فصل پک کر اُٹھ جاتے تو وہ اپنی بیوی اور بیٹی کو لے کر آجائے گا۔

یہ امیر کبیر آدمی بھی زمیندار تھا جس کی گھوڑی چوری ہو گئی تھی۔ میں مصلحتاً اس کا نام ظاہر نہیں کر رہا۔ یہ شکار کھیلنے گیا تھا۔ راستے میں اس لڑکی کا گاؤں پڑتا تھا۔ اُس نے لڑکی کو گاؤں سے باہر دیکھا تھا۔ یہ زمیندار لڑکی کے باپ کو کچھ رقم دے کر چلا گیا۔ اس کے بعد وہ کئی بار اس غریب آدمی کے گھر گیا۔ کبھی لڑکی کے لئے کپڑے لے جاتا کبھی کوئی اور تحفہ لے جاتا۔ لڑکی کا باپ پہلے ہی پریشان تھا۔ لڑکی پر کتنی لوگوں کی نظر تھی۔ اتفاق سے لڑکی اتنی ہوشیار اور چالاک تھی کہ کسی کے ہاتھ نہیں آتی تھی۔ اسے بدنام تو کیا جاتا تھا لیکن کسی کے پاس اس کے چال چلن کے خلاف کوئی ثبوت نہیں تھا۔

باپ نے بیان میں کہا کہ یہ زمیندار لڑکی کو براہِ راست تحفے اور

میں نذرانہ رکھا اور عرض کی، یا سرکار! لڑکی جوان ہو گئی ہے یہ ہماری واحد اولاد ہے۔ دعا کریں خدا ہمیں اولاد نہ دے۔ پیر نے جوان لڑکی کا نام سنا تو کہا کہ اُسے ساتھ لاؤ۔ ہم دیکھیں گے کہ اس لڑکی نے اپنے پیچھے اولاد کا دروازہ کیوں بند کر دیا ہے۔ دوسرے روز وہ لڑکی کو پیر کے پاس لے گئے۔ تصور کیا جاسکتا ہے کہ ایسی خوبصورت لڑکی کو دیکھ کر پیر حکیم صاحب کے دل میں کیا آیا ہو گا۔ اُس نے لڑکی کی آنکھوں میں جھانکا۔ اُس کے ہاتھ اُٹھ کر کے دیکھے اور لڑکی کو باہر بھیج کر اُس کے ماں باپ سے کہا۔ ”یہ لڑکی انسان نہیں۔ یہ جنات کی نسل سے ہے۔ تم اپنا رنگ روغن دیکھو اور لڑکی کا رنگ روغن دیکھو۔ کیا تمہارے خاندان میں کسی کی آنکھیں اس طرح نیلی ہیں؟ جب تک یہ لڑکی زندہ ہے، تمہارے گھر اولاد نہیں ہوگی۔“

اس غریب اور گنوار آدمی نے یہ نہ سوچا کہ جن کسی انسان کے بطن سے کس طرح پیدا ہو سکتا ہے مگر وہ پہلے ہی حیران تھا کہ گورے رنگ اور نیلی آنکھوں والی لڑکی اُس کے گھر کیسے پیدا ہوئی۔ اُس نے پیر کا انکشاف سچ مان لیا۔ پیر نے اُسے کہا کہ وہ لڑکی تو اُس کے پاس لاتا ہے۔ اُس نے لڑکی کی ماں کو ایک تعویذ دے دیا۔ باپ دوسرے دن لڑکی کو پیر کے پاس لے گیا۔ پیر نے لڑکی کو لٹا کر کچھ پڑھا اور اُس کی آنکھوں میں پھونکیں ماریں۔ کچھ اوٹ پٹانگ حرکتیں کیں اور حکم دیا کہ کل اسے پھر لے آنا۔

دوسرے دن باپ لڑکی کو لے گیا تو پیر لڑکی کو الگ کمرے میں لے گیا۔ کچھ دیر بعد وہ لڑکی کو باہر لایا۔ لڑکی کا چہرہ سُرخ ہو رہا تھا۔ وہ باہر نکل گئی۔ پیر نے لڑکی کے باپ سے کہا کہ یہ شیطان جن ہے۔ تم اسے کہنا کہ میرے ساتھ آئندہ بد تمیزی نہ کرے۔ میرا حکم مانے۔ کل اسے پھر لے آنا۔۔۔۔۔ باپ باہر نکلا تو لڑکی اُس کا انتظار کرتے بغیر اپنے گاؤں کو جا رہی تھی۔ باپ دوڑ کر اُس سے جا ملا۔ لڑکی اُس پر برس پڑی۔ کہنے لگی کہ وہ آئندہ یہاں نہیں آئے گی۔ اُس نے پیر کو بد معاش اور خوفناک کہا۔ باپ کا پسینہ نکل آیا۔ پیر کی بے ادبی کا انجام اُسے ڈرانے لگا۔ لڑکی نے باپ سے کہا۔ ”اگر مجھے بد چلن بنانا ہے تو کیا یہی آدمی رہ گیا تھا؟“ لڑکی نے باپ کو پوری طرح بتایا کہ اس شخص نے اسے پھانسنے کے کیسے کیسے جتن کئے ہیں۔ ”مجھے کہتا ہے کہ تم ایک جن کی اولاد ہو، میں تمہیں انسان بنا دوں گا۔“

لگے روز لڑکی نے پیر کے پاس جانے سے انکار کر دیا۔ اس سے اگلے روز بھی نہ گئی۔ اُس روز زہیندار آگیا۔ وہ اس گھر میں بیٹھا ہوا تھا کہ پیر حکیم صاحب بنفس نفیس تشریف لے آتے۔ یہ شخص اتنی خوبصورت چڑیا کو اپنے جال سے اتنی آسانی سے نکل جانے کو برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ پیر نے لڑکی کے باپ کو الگ لے جا کر کہا۔ ”مجھے رات کو اشارہ ملا ہے کہ اس لڑکی کا باپ اُن جنات میں سے ہے جو میرے قبضے میں ہیں۔ میں نے اُسے حاضر کر کے کہا ہے کہ لڑکی سے

اپنا قبضہ اٹھائے تاکہ اس غریب آدمی کے گھر اولاد پیدا ہو۔ یہ جن ابھی مانا نہیں۔ اُس نے کہا ہے کہ میری بیٹی کو اپنے پاس لے آؤ.... تم غریب اور نادار آدمی ہو۔ مجھے خدا کا حکم ہے کہ غریبوں کو آفات سے بچاتے رکھوں.... اور یاد رکھو۔ اس شخص (زمیندار) کو گھر میں داخل نہ ہونے دو۔ یہ ناپاک آدمی ہے۔ یہ اس لڑکی کے لئے یہاں آتا ہے۔ اگر لڑکی اس کی باتوں میں آگئی تو تمہارا جھوٹا بھل جانے کا اور اور تمہاری بیوی کی کوکھ ہمیشہ کے لئے ویران ہو جاتے گی۔“

میرے شہری قاتلین اور تسلیم یافتہ حضرات پیر کی ان باتوں کو شاید کسی افسانے کی تحریر سمجھیں۔ میں تو اپنی جوانی کے دور کی بات کر رہا ہوں آج بھی دیہات میں چلے جاتیں، آپ کو پیروں کی یہی باتیں سنائی دیں گی اور لوگ انہیں برحق مانتے ہیں۔ ایسے دیہات کی کمی نہیں جو ڈاکٹروں اور جدید دوائیوں سے محروم ہیں۔ وہاں تعویذ اور ٹونے ٹوٹکے چلتے ہیں۔ اگر کسی فوجی کے ہاتھ کوئی انگریزی دوائی چلی جاتے تو پیر، شاہ اور امام مسجد اسے شکر قرار دیتے ہیں۔ یہ لوگ ہسپتال، مرگی اور نمونیہ کو بھی شہر شرار اور جنات کا قبضہ یا سایہ کہتے اور اللہ کے سادہ دل بندے اسے تسلیم کرتے ہیں۔ مجھے جب لڑکی کا باپ پیر کی یہ باتیں سننا رہا تھا تو میں بالکل حیران نہیں ہو رہا تھا۔ میں آج بھی حیران نہیں ہوتا۔ پیر کی ایسی خوفناک بات سن کر باپ بہت خوفزدہ ہوا۔ پیر لڑکی کے سر اور منہ پر ہاتھ پھیر کر چلا گیا۔ باپ نے زمیندار کو الگ لے جا کر

کہا کہ یہ لڑکی اُس کی بیٹی نہیں یہ ایک جن کی اولاد ہے۔ اُس نے زمیندار کو یہ بھی بتایا کہ لڑکی اُس (زمیندار) کی باتوں میں آگئی تو نتیجہ کیا ہوگا۔ زمیندار نے لڑکی کے باپ کو بتایا کہ یہ پیر نو سر باز اور بدکار ہے اور یہ لڑکی پر قبضہ کرنے کے عین کردار ہے۔ اُس نے کہا کہ جن انسان کے بطن سے جنم نہیں لے سکتے۔ باپ بالکل گنوار اور لاپمانہ ذہن کا تھا۔ اُس نے کانوں پر ہاتھ رکھے اور زمیندار کے آگے ہاتھ جوڑ کر کہا کہ وہ سرکار کی بے ادبی اُس کے گھر بیٹھ کر نہ کرے ورنہ اس غریب کا جھوٹا بھل جاتے گا اور اس کی بیوی کے ہاں کبھی سچ پیدا نہیں ہوگا۔ زمیندار اسے قائل نہ کر سکا۔ زمیندار کوئی عالم فاضل تو نہیں تھا جو علم کے زور سے اس گنوار آدمی کو اس غریب کار پیر کے خلاف قائل کرتا۔ وہ خود غریب کار تھا اور وہ پیر کو رقیب بھی سمجھنے لگا تھا۔

## لڑکی پیر کے گھر میں

باپ نے مجھے روتے ہوئے بتایا کہ وہ بہت بُرے چکر میں پھنس گیا۔ ایک طرف پیر تھا جس کے ہاتھ میں اُس کی قسمت اور جنات تھے۔ دوسری طرف یہ زمیندار تھا جسے زیر باپ نہ گاؤں کا کوئی اور آدمی یہ کہہ سکتا تھا کہ اس گھر میں ایک لڑکی جو ان ہے اس لئے اس گھر میں نہ آیا کرو۔ دیہاتیوں پر ایسے ہی پیروں، زمینداروں، جاگیرداروں اور

لڑکی کو قائل کر لیا کہ وہ پیر کے ساتھ الگ کمرے میں چلی گئی۔

تھوڑی دیر بعد پیر باہر آیا۔ لڑکی اُس کے ساتھ نہیں بھتی پیر نے اُس کے ماں باپ سے کہا کہ اُس نے لڑکی کے باپ کو حاضر کر لیا ہے۔ وہ لڑکی کی ملکیت سے دستبردار نہیں ہو رہا۔ تم دونو گھر چلے جاؤ۔ چند دن لگیں گے۔ میں تمہیں خود ملا لوں گا۔۔۔ ماں اور باپ خوشی خوشی اپنے گاؤں چلے گئے۔ پیر کا جاؤ پوڑا پوڑا اثر کر چکا تھا۔ باپ نے مجھے بتایا کہ آٹھ روز بعد گھوڑی کی چوری کی واردات والی صبح (پیر اس کے گھر آیا۔ وہ سخت غصے میں تھا۔ اُس نے آتے ہی پوچھا۔ ”وہ نامراد کساں ہے؟“ باپ نے پوچھا کہ سرکار کس کا پوچھ رہے ہیں؟ ”سرکار“ نے انہیں بتایا کہ اُن کی لڑکی بھاگ آتی ہے۔ ماں باپ نے لاعلمی کا اظہار کیا مگر پیر مان نہیں رہا تھا۔ وہ اُن پر الزام لگا سنے جا رہا تھا کہ لڑکی اُس کے گھر سے بھاگ آتی ہے اور انہوں (ماں باپ) نے اُسے زمیندار کے حوالے کر دیا ہے یا اُسے کہیں چھپا دیا ہے۔

یہ بھی آپ کی دلچسپی کے لئے بتا دوں کہ پیر جب لڑکی کے گھر آتا تھا تو اُس نے سراور چہرہ کھیس میں چھپایا ہوا ہوتا تھا اور وہ اپنے خاص گھوڑے پر نہیں آتا تھا تاکہ کسی کو پتہ نہ چلے کہ یہ پیر حکیم صاحب ہے۔ یہ شخص اپنے مریدوں کے گاؤں کے دورے پر جایا کرتا تھا۔ اس کا دورہ ہمارے آج کل کے وزیریوں سے کم نہیں ہوتا تھا۔ آگے آگے تین چار سبز جھنڈے، پیچھے پیر کی سواری اور اس کے پیچھے خصوصی

ملاؤں کی حکومت رہی ہے (اور ابھی تک ہے) وہ انگریزوں کی بادشاہی میں بھی بے زبان تھے اور آزاد ہو کر بھی بے زبان ہیں۔ باپ لڑکی سے غمزدہ رہنے لگا کیونکہ لڑکی جنات کی نسل سے تھی۔

ایک رات لڑکی پھر غائب ہو گئی اور اُسی رات کے بعد آتی۔ نہ ماں کو جرات ہوتی نہ باپ کو کہ اُس سے پوچھتے کہ وہ کہاں چلی گئی تھی۔ اگلے سات دنوں میں زمیندار بھی ان کے ہاں آتا رہا اور پیر بھی دو دفعہ آیا لڑکی کا اب یہ رویہ تھا کہ دونوں کے ساتھ ہنس کر بولتی اور اچھا برتاؤ کرتی، لیکن وہ پیر کے گھر جانے سے صاف انکار کر دیتی۔۔۔ ماں اور باپ پیر کے ہاں جاتے تھے۔ ایک روز پیر نے انہیں اس قدر ڈرایا کہ وہ ڈر سے کانپتے گھر آئے۔ دونوں نے لڑکی کی اتنی منت سماجت کی کہ باپ نے لڑکی کے پاؤں چھو کر اُسے کہا کہ اُس کی شادی ہو جائے گی تو ماں باپ اکیلے رہ جائیں گے۔ پیر دعا کرے گا تو اولادِ زینہ ہوگی جو بڑھاپے کا ساتھ اور سہارا ہوگی۔ لڑکی شاید یہ برداشت نہ کر سکی کہ باپ اُس کے پاؤں پڑا تھا۔ وہ پیر کے ہاں جانے پر رضامند ہو گئی۔

دوسرے روز لڑکی ماں باپ کے ساتھ پیر حکیم صاحب کے پاس گئی۔ پیر نے ماں باپ کے سامنے لڑکی سے کہا۔ ”میں شیطان اور بدنیت انسان نہیں ہوں۔ میں تمہارے وجود میں انسان کی رُوح ڈالنا چاہتا ہوں۔ اس سے یہ ہو گا کہ تمہارے ماں باپ کے دل پھر جائیں گے۔“ کچھ ایسی ہی اور باتیں تھیں اور پیر کی اداکاری بھی تھی جس نے

وہ بے تکلفی سے اور بے خوف ہو کر بیان دینے لگی۔ بیان ختم کرنے تک وہ بالکل ہی بے خوف ہو چکی تھی۔

## گورے رنگ اور نیلی آنکھوں کا بھید

”لوگ کہتے ہیں یہ لڑکی تنہا رے بطن سے پیدا نہیں ہوتی۔“ میں نے اُسے کہا۔ ”تمہیں یہ لڑکی کہیں سے ملی تھی، یا یہ کسی اور کی بچی تھی جسے تم اٹھا لاتی تھیں؟“ اُس کے چہرے کا رنگ صاف طور پر پیلا پڑ گیا۔ وہ ڈر گئی کہ میں اُس پر بچی کے اغوا کا الزام عائد کر رہا ہوں۔ اُس کے ہونٹ کاپنے لگے۔ اُس کی ایسی حالت دیکھ کر مجھے اُس پر ترس آگیا لیکن میں حقیقت معلوم کرنا چاہتا تھا۔ میں نے کہا۔ ”بولو، سچ بتا دو گی تو میں کوئی کارروائی نہیں کروں گا۔“

”میرے خاوند کو تو نہیں بتائیں گے؟“ اُس نے پوچھا اور اُس کے آنسو بہہ نکلے۔

”میں مسلمان ہوں۔“ میں نے کہا۔ ”اور میں نے تمہیں بہن کہا ہے۔ کسی کو نہیں بتاؤں گا۔“ یہ میرے دل کی آواز تھی۔ مجھے اس سے کوئی غرض نہیں تھی کہ یہ لڑکی اُس کی اپنی ہے یا کہیں سے لائی گئی ہے۔

مریدوں اور درباریوں کا جلوس ہوتا تھا۔ یہ جلوس کلمہ شریف کا ورد کرتا جاتا تھا، مگر لڑکی کے گھر وہ بہروپ میں جاتا تھا۔ لڑکی کا گاؤں پیر کے گاؤں سے اڑھائی میل کے لگ بھگ دور تھا۔ اُس صبح بھی پیر کیس میں چہرہ چسپاں کیا۔ لڑکی کے ماں باپ روتے اور اُس کے قدموں میں بچہ بچہ جاتے تھے، مگر پیر کو ان پر اعتبار نہیں آ رہا تھا۔ وہ دوپہر تک ان کا خون خشک کرتا رہا، پھر دھمکی دے کر چلا گیا۔

باپ کا بیان ختم ہوا تو میں نے لڑکی کی ماں کو بلایا۔ ماں کی آنکھیں نیلی نہیں تھیں۔ اُس کا رنگ گورا بھی نہیں تھا، البتہ اس علاقے کے لوگوں کی نسبت اُس کا رنگ کچھ اہواگندمی تھا۔ اُس کے چہرے کے نقش اچھے تھے جو غربت، محنت مزدوری اور پریشانیوں کے اثرات سے بچے بچے سے تھے۔ میں اس کے رنگ اور نقوش کو یہ معجزہ کرنے کے لئے دیکھ رہا تھا کہ گورے رنگ اور نیلی آنکھوں والی بیٹی اس عورت کی ہو سکتی ہے یا نہیں۔ نہیں ہو سکتی تھی۔ یہ غریب عورت تھی۔ بُری طرح ڈری ہوئی تھی۔ میں نے بڑی مشکل سے اس کا دُور کیا۔ اُسے اپنی بہن کہا۔ ہمدردی کا اظہار کیا اور اُس نے زبان کھولی اُس نے بالکل وہی بیان دیا جو اُس کا خاوند دے گیا تھا۔ دونوں کے بیانوں میں مجھے معمولی سا اختلاف بھی نظر نہ آیا۔ میں اُس کی حوصلہ افزائی کرتا اور اُسے فتنے دیتا جا رہا تھا اور اس کے دل سے یہ خوف بھی نکالتا گیا۔ کہ اُس کے خلاف کوئی کارروائی کی جائے گی۔ میرے اس رویے سے

تم بہت اچھا۔ ہم غریب لوگ، انگریزوں کو بادشاہ اور ان دانا سمجھتے ہیں۔ ہمارا ایمان پیٹ میں ہوتا ہے۔ صاحب نے میرے ہاتھ میں پانچ روپے کا نوٹ دیا۔۔۔ یہ لڑکی جسے میرا خاوند اپنی بیٹی کہتا ہے اس انگریز میجر کی بیٹی ہے۔ جب یہ بیٹی پیدا ہوئی تو ہم اسی میجر کے سرونٹ کو ارڈر میں رہتے تھے۔ میرے خاوند نے بچی کو دیکھا تو اُس نے حیران ہو کر مجھے دیکھا۔ مجھ سے پوچھا۔ یہ بچی میری نہیں ہو سکتی۔ اس آدمی پر میرا رعب چلتا تھا میں نے اسے بہت بُری گالیاں دیں، حالانکہ وہ سچا تھا۔ میں نے اسے منوالیا کہ یہ اُسی کی بچی ہے۔۔۔

”صاحب کی میم اچلی تھی۔ اُس کے دوست تھے۔ صاحب ٹھیک کہتا تھا۔ میم بہت بھدی تھی۔ میری بچی چھ سات ماہ کی ہوتی تو ایک روز میں اُسے اٹھاتے بنگلے میں چلی گئی۔ میم صاحب نے پہلی بار میری بچی کو دیکھا۔ اُس نے مجھے مبارک باد دی اور خوشی کا اظہار کیا مگر اُس نے بچی کو دیکھا تو چونک کر مجھے دیکھا۔ غصے میں لہوئی۔ یہ بے بی تم کہہ کر سے لایا؟ میں نے جواب دیا کہ میری اپنی بچی ہے۔ اُس نے مجھے گالیاں دیں۔ وہ طبیعت کی غصیلی تھی۔ اندر گئی اور صاحب کے ساتھ اپنی زبان میں لڑنے لگی۔ اُسی روز اُس نے مجھے اور میرے خاوند کو لڑکری سے جواب دے دیا۔ میرے خاوند کو پتہ نہ چل سکا کہ کیا وجہ ہے۔ ہمیں میم نے جواب دیا تھا۔ صاحب باہر نہیں آیا۔ میم نے کہا کہ کو ارڈر فوراً خالی کرو۔ ہم وہاں سے نکل گئے۔ کچھ دن خراب ہوتے،

”یہ لڑکی میری اپنی ہے۔“ اُس نے جواب دیا۔ ”لیکن یہ میرے خاوند کی نہیں۔“ وہ چپ ہو گئی اور اُس نے سر جھکا لیا۔ میری عرصہ افزائی اور بہت سے اصرار کے بعد لہوئی۔ ”میری شادی جبل پور چھاؤنی میں ہوتی تھی۔ میں شیم تھی۔ میرا خاوند بھی دُنیا میں اکیلا رہ گیا تھا۔ مجھے ماموں نے پالا تھا۔ ہم سب چھاؤنی میں انگریز فوجی افسروں کے بنگلوں میں لڑ کر تھے۔ میرا خاوند ایک منہجر کے بنگلے میں بیڑہ تھا۔ وہ مجھے شادی کے بعد وہیں لے گیا۔ صاحب نے ہمیں سرونٹ کو ارڈر دے دیا ایک روز دوپہر کے وقت صاحب نے میرے خاوند کو آواز دی۔ بہت گرمی تھی۔ میرے خاوند کو بخار آرہا تھا۔ مجھے کہنے لگا کہ تم چلی جاؤ۔ کہہ دینا مجھے تیز بخار آرہا ہے۔ میں چلی گئی۔ صاحب بنگلے میں اکیلا تھا۔ اُس کی بیوی گرمیاں گزارنے پہاڑ پر چلی گئی تھی۔ میں نے اُسے ابھی دیکھا نہیں تھا۔۔۔

”میں صاحب کے پاس گئی اور اُسے بتایا کہ میرا خاوند بیمار ہے، مجھے حکم دو۔ صاحب نے وہ کام مجھے بتایا جس کے لئے اُس نے میرے خاوند کو آواز دی تھی۔ میں نے کام کر دیا تو اُس نے مجھے سونے کے کمرے میں بلایا۔ اُس وقت میری عمر اٹھارہ انیس سال تھی۔ صاحب نے مجھے اپنے پاس بٹھا کر ٹوٹی پھوٹی اُردو میں کہا کہ میری میم صاحب بہت بھدی ہے۔ اُسے میں نے گرمی شروع ہونے سے پہلے ہی پہاڑ پر بھیج دیا ہے۔ اُس نے کہا۔ ہمارا میم صاحب بہت کھراب۔

نُسنے یا کہنے سے ڈرتی تھی لیکن وہ پیروں کے احترام اور حقیقت کے درمیان چنسی ہوتی نظر آتی تھی۔ میرے سوال کے جواب میں اُس نے لہا "سرکار (پیر حکیم صاحب) کا کہنا سنا آنکھوں پر۔ انہیں غیب سے اشارے ملتے ہیں، لیکن یہ لڑکی جس کی اولاد ہے وہ میں لے بتا دیا ہے۔ اگر سرکار نے کہا ہے کہ اولاد ہوگی تو شاید ہو جائے، مجھے اس خاوند کی اولاد کی امید نہیں۔ اگر اس کی اولاد ہوئی ہوتی تو اکیس بائیس سالوں میں ایک بچہ تو ضرور ہوتا۔"

"لڑکی کہاں ہوگی؟"

وہ تمہیں کھانے لگی کہ اُسے معلوم نہیں۔ اسے وہ پیر کے گھر چھوڑ آتے تھے۔ میں نے زمیندار کا نام لے کر پوچھا کہ اُس کے ساتھ لڑکی کے تعلقات کیسے تھے؟ کیا یہ ہو سکتا ہے کہ لڑکی اُسے پسند کرتی ہو اور لڑکی کو اسی زمیندار نے پیر کے گھر سے اغوا کر لیا ہو؟

"معلوم ایسے ہی ہوتا تھا جیسے وہ اس زمیندار کو پسند کرتی ہے۔" اُس نے جواب دیا۔ "اُس کے تحفے، کپڑے اور پیسے ہنسی خوشی لے کے رکھ لیتی تھی۔ وہ راتوں کو باہر نکل جاتی تھی تو مجھے یقین ہوتا تھا کہ زمیندار کہیں جنگل میں آیا ہے اور یہ اُسے ملنے گئی ہے۔"

"تم لڑکی سے ڈرتی ہو؟"

"بہت ڈرتی ہوں۔" اُس نے جواب دیا۔ "وہ ہماری سُنتی ہی نہیں۔"

پھر ایک جگہ نوکری ملی۔ یہ صاحب بھی ویسا ہی تھا جیسا پہلا تھا میں اب سنبھل گئی تھی۔ ایک غلطی کی سزا جھگڑ کر ویسی ہی دوسری غلطی نہ کی۔ نوکری چھوڑ کر ہم اس گاؤں میں آ گئے۔ محنت مزدوری کرتے رہے۔ میرے خاوند نے کھیتی باڑی سیکھ لی۔ وہ شروع میں کہتا رہا کہ انگریزوں کی نوکری میں جو مزدور ہیں وہ اور کہیں نہیں لیکن میں بھوکے مرنے کو تیار تھی انگریزوں کی نوکری منظور نہیں تھی۔ خدانے میری وہ ایک بھول جو میں نو جوانی کی نادانی میں کر بیٹھی تھی ابھی تک معاف نہیں کی۔ اپنے خاوند کو دھوکہ دینے والی عورت کو خدا معاف کیا ہی نہیں کرتا۔ یہ لڑکی آج تک میرے لئے سزا بنی ہوتی ہے۔"

وہ بہت روتی۔ انگریز انسروں کے اخلاق کو اور ان کے ہندوستانی نوکروں کی مجبوریوں کو ہم اچھی طرح سمجھتے تھے۔ یہ تو ایک انگریز نے ایک غریب ہندوستانی لڑکی کو خراب کیا تھا، میں ایسے انگریز فوجی انسروں کے نام بتا سکتا ہوں جن کی میموں نے اپنے فوجی اربابوں کے ساتھ آشنائی کر رکھی تھی۔ ان میں تین پنجابی اور ایک پٹھان تھا۔ انگریزوں کی اخلاقی حالت کچھ ایسی ہی تھی۔

"تم تو اپنے خاوند کی طرح اس دہم کو نہیں مانتی ہوگی کہ یہ لڑکی کسی جن کی اولاد ہے۔" میں نے کہا۔ "کیا تم بھی یہی سمجھتی ہو کہ یہ لڑکی تمہارے گھر سے چلی جاتے تو تمہارے ہاں اولاد ہوگی؟"

وہ پسماندہ ذہن کی عورت تھی اس لئے پیر کے خلاف کوئی بات



## میرا مسئلہ — لڑکی؟ گھوڑی؟ یا قتل؟

اُس سے کچھ اور باتیں پوچھیں۔ کچھ باتیں اُسے سمجھاتیں اور مبالغہ بیوی کو گھر بھیج دیا۔ میرے سامنے بڑا ہی پیچیدہ مسئلہ تھا۔ یہ نہ گھوڑی کی چوری کا تھا نہ لڑکی کی گمشدگی کا، یہ رائے گھوجی کے قتل کا مسئلہ تھا۔ میں نے فرض کر لیا تھا کہ کسی جراثم پیشہ گردہ کی واردات ہے۔ میرے ذہن میں بار بار مینا اور بسا کھاتے تھے۔ عثمان کے ساتھ تبادلہ خیالات کرتے ہوئے مجھے یہ امکان نظر آنے لگا کہ یہ واردات اس پیر کی ہے۔ پیر کے پاس بھی جراثم پیشہ آدمی تھے جن کے ہاتھوں وہ رائے کو قتل کرا سکتا تھا۔ مجھے یہ امکان بھی نظر آیا کہ واردات زمیندار کی ہے۔ وہ بھی اپنی حیثیت کے رعب اور پیسے کے زور سے قتل جیسے بھانک جرم کا ارتکاب کرا سکتا تھا۔ ان امکانات کو دو چیزیں رد کرتی تھیں۔ ایک یہ کہ پیر کے گھر سے لڑکی غائب ہوتی تھی اور زمیندار کے گھر سے گھوڑی چوری ہو گئی تھی۔

اس گورگھ دھندے کو سیدھا کرنے کے لئے زمیندار اور پیر سے ملنا بہت ضروری ہو گیا۔ ان کے سینوں سے راز نکالنا بڑی اُستادی کا، بلکہ مدارائیوں جیسا کام تھا۔ میں جس وقت لڑکی کے ماں باپ کے ساتھ مصروف تھا اس دوران عثمان نے یہ انتظام کر دیا تھا

کہ علاقے کے تمام مجبوروں کو ہدایات بھیج دی تھیں کہ مینا اور بسا کے کی اطلاع دیں۔ ان کا کوئی بھی آدمی جہاں کہیں نظر آجائے تھانے میں۔ بلند انداز پر اطلاع دیں۔ جراثم پیشہ گردہوں کے سرغٹوں کا تلاش کا طریقہ اور ذریعہ صرف مخبر ہوتے تھے۔ اس کے لئے آج تک کوئی سائنسی طریقہ ایجاد نہیں ہوا۔ عثمان نے علاقے کے بعض سزا یافتہ جراثم پیشہ آدمیوں کو تھانے حاضر کر دیئے۔ ان کے لئے کانٹیل بھیج دیتے تھے۔ یہ وہ لوگ تھے جو چھوٹی موٹی وارداتیں بھی کرتے رہتے اور پولیس کے لئے مخبری بھی کرتے تھے۔ پولیس کی طرف سے انہیں یہ صلہ ملتا تھا کہ کبھی کبھی رقم دے دی جاتی یا کسی کی ایک آدھ واردات کی تفتیش گول کر دی جاتی تھی۔

میں نے گھوڑے پر ایک کانٹیل کو زمیندار کے گاؤں اس پیغام کے ساتھ بھیجا کہ فوراً تھانے آتے۔ وہ جب آبارات ہو چکی تھی میں نے کسی تہید کے بغیر پوچھا: ”آپ کو گھوڑی چاہیے؟“

”ہاں ہاں! اُس نے بے تاب ہو کر پوچھا: ”زل گئی ہے؟“

”جوڑی آپ لڑکی لادیں گے میں آپ کی گھوڑی آپ کو دے دوں گا۔“

”لڑکی؟ اُس نے حیران ساہو کے پوچھا: ”کون سی لڑکی؟“

”نیلی آنکھوں والی۔“

وہ سچہ سا گیا۔ کہنے لگا کہ اس لڑکی کے متعلق وہ کچھ نہیں جانتا۔

”دن کو جاتے تھے؟“

”اُس نے ذرا سوچ کر جواب دیا۔ ”ہاں۔ میں دن میں چند ایک بار لیا ہوں۔“ وہ مسکرایا۔

میں نے اپنا رویہ کچھ نرم کر لیا۔ کچھ باتیں اُس نے بتائیں، کچھ میں نے پوچھیں۔ اُس نے کوئی پردہ نہ رہنے دیا۔ اس نے لڑکی کے ماں باپ کے بیان کی تصدیق کر دی۔ وہ یہ بھی مان گیا کہ اس کی اور پیر کی رتابت مٹی اور عداوت بھی۔ اس نے یہ اعتراف بھی کیا کہ وہ لڑکی کے ساتھ شادی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ یہ تو اسے بچانے کے ڈھنگ تھے۔ وہ اس لڑکی کی خاطر اس کے ماں باپ کو زمین کا ایک ٹکڑا دینے کو تیار تھا۔

”لڑکی آپ کو پسند کرتی تھی؟“

”نہیں۔“ اُس نے جواب دیا۔ ”وہ نہ مجھے پسند کرتی تھی نہ پیر کو۔“

”آپ نے کسے معلوم کیا؟“

”اُس نے مجھے کبھی دھتکارا نہیں تھا۔“ اُس نے جواب دیا۔

”میرے تحفے اور کپڑے اور پیسے خوشی سے لے لیتی تھی لیکن مجھے دو ہاتھ دُوری رکھتی تھی۔ میں صاف سمجھ جاتا تھا کہ یہ مجھے قبول نہیں کر رہی۔ لڑکی بہت چالاک اور ہوشیار ہے۔ میں اب محسوس کرنے لگا ہوں کہ میں اس کے ساتھ کھیلنا چاہتا تھا لیکن وہ مجھے انگلیوں پر سچاتی رہی.... پیر سے تو وہ نفرت کرتی تھی۔“

”کما میں وہ تمام کپڑے اور پیسے آپ کے سامنے رکھ دوں جو آپ لڑکی کو اس کے گاؤں میں جا کر دیتے رہے ہیں؟“ میں نے کہا اور اُس کے چہرے کے تاثرات کی تبدیلی دیکھنے لگا۔ تبدیلی بڑی صاف تھی۔ کیا آپ سچے دل سے اس لڑکی کے ساتھ شادی کرنا چاہتے تھے؟۔ اُسے خاموش دیکھ کر میں نے کہا۔ ”آپ بہت کچھ جانتے ہیں۔ ایک آدمی قتل ہو گیا ہے جو پولیس کے محکمے کا قیمتی آدمی تھا۔ میں آپ کو شہید بنانا حوالت میں بند کر سکتا ہوں۔“

اُسے اچانک یاد آگیا کہ وہ اُدنی حیثیت کا آدمی ہے اور انگریزوں کا منظورِ نظر۔ بولا۔ ”آپ نے ایک تو مجھے بے وقت بلایا ہے، دوسرے کہ آپ مجھے دھمکیاں دے رہے ہیں۔ اپنی نوکری کو خطرے میں ڈالیں۔ میری اتنی قیمتی گھوڑی چوری ہو گئی ہے اور آپ مجھے ایک لڑکی کے ساتھ واسطہ کر رہے ہیں۔“

”اور میں آپ کو رائے گھوجی کے قتل کے جرم میں شامل تفتیش ہوں۔“ میں نے تھانیداروں کے لیے میں کہا۔ ”میں جو پوچھتا ہوں اس کا جواب دیں.... کیا آپ لڑکی کے گھر نہیں جاتے تھے؟ وہ میرے مُنہ کی طرف دیکھتا رہا۔ میں نے پوچھا۔ ”کیا آپ رات کو لڑکی کے گاؤں کے باہر لڑکی سے چوری چھپے نہیں ملتے تھے؟“

”نہیں۔“ اُس نے تڑپ کر جواب دیا۔ ”میں کبھی رات کو اُسے ملنے نہیں گیا تھا۔“

”میرا خیال ہے وہ رات کو کبھی کبھی آپ کو گناؤں سے باہر ملتی تھی۔“ میں نے کہا۔ ”آپ اُسے دن کو بتا دیتے ہوں گے کہ آپ فلاں رات فلاں جگہ آتے تھے۔“

”میں نے آپ کو سب کچھ بتا دیا ہے۔“ اُس نے کہا۔ ”یہ چھپانے کی کیا ضرورت ہے کہ وہ مجھے رات کو ملتی تھی یا نہیں۔ میں نے اسے دو تین بار کہا تھا کہ میں رات کو آؤں گا۔ آپ یقین جانیں اُس نے ہر بار یہی جواب دیا تھا کہ دن کو آجایا کریں، رات والی بات دل سے نکال دیں۔“

لڑکی کے باپ نے مجھے بتایا تھا اور ماں نے بھی کہ لڑکی کبھی کبھی رات کو باہر جاتی اور دیر سے آتی تھی۔ دونوں کو یقین تھا کہ رات کو یہ زمیندار کسی جگہ آتا ہے۔ میں نے بھی یہی راستے قائم کی تھی لیکن زمیندار کہہ رہا تھا کہ ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ لڑکی جاتی ضرور تھی میرے ذہن میں یہ سوال پیدا ہو گیا کہ وہ کس کے پاس جاتی تھی؟ اُس سے ملنے کون آتا تھا؟ کیا وہ آدمی یہی تو نہیں جس کے ساتھ لڑکی پیر کے گھر سے بھاگ گئی ہے؟ پھر وہی سوال سامنے آگئے کہ گھوڑی کون لے گیا؟ رائے کو کس نے قتل کیا؟

”میں نے یہ سوچا ضرور تھا کہ لڑکی ہاتھ نہ آتی تو اسے اغوا کرالوں گا۔“ زمیندار نے کہا۔ ”لیکن اُس پر پیر نے قبضہ کر لیا۔ لڑکی کے فرار سے ظاہر ہوتا ہے کہ اُس کا دل کہیں اور تھا اور وہ اُس آدمی کے

ساتھ چلی گئی ہے۔“

”لڑکی جاتے جہنم میں۔“ میں نے جھنجھاکر کہا۔ ”مجھے رائے کھوجی کا قاتل مطلوب ہے۔ کیا آپ میری یہ مشکل حل کر سکتے ہیں؟“

”میں نے بہت سوچا ہے۔“ اُس نے کہا۔ ”وہ میری گھوڑی کے کھڑے پر جا رہا تھا۔ آپ بتاتے ہیں کہ لڑکی اسی گھوڑی پر گئی ہے۔ یہ مشکل پیر حل کر سکتا ہے۔“

میں نے اپنے انداز کی پوچھ گچھ کی۔ یہ شخص مجھے صاف نظر آیا۔

میں جہنم کے دربار میں گیا

میں اگلے روز پیر کے ہاں گیا۔ مجھے دیکھ کر اُس نے اپنے اوپر جلالی کیفیت طاری کر لی۔ میں اُس کے قریب بیٹھا۔ مریدوں کی طرح سلام کیا۔ وہ مراقبے میں چلا گیا۔ میں دانستہ خاموش بیٹھا رہا۔ مجھ پر اُس کا تقدس طاری ہوا نہ رعب۔

”میرے پاس کیوں آتے ہو؟“ اُس نے آنکھیں بند کئے تہو تے کہا۔ ”میں تمہاری صورت نہیں دیکھنا چاہتا۔ میرے ایک آدمی نے تمہاری سفارش کی ہے کہ تم شریف آدمی ہو، ورنہ تمہارا انجام بہت بُرا ہوتا۔ تم میری غیر حاضری میں میری اجازت کے بغیر میرے گھر میں داخل ہوتے پھر جو کچھ سمیت اس درگاہ کی چھت پر گتے۔ تم نے یہ

وہ اس طرح بدکا جیسے اُسے کسی نے سُوتی چھو دی ہو۔ کچھ دیر  
 اُنھیں بھاڑ کر مجھے دیکھتا رہا پھر آگے جھک کر سرگوشی میں مجھ سے پوچھا  
 ”راما کھوجی قتل ہو گیا ہے؟“  
 ”آپ کو کسی نے نہیں بتایا؟“  
 ”نہیں۔“ اُس نے جواب دیا۔

میں سوچنے لگا کہ کیا اس شخص کو واقعی علم نہیں کہ راما قتل ہو گیا  
 ہے؟ قتل اس کی بستی سے دُور ہوا تھا۔ میں جانتے واردات پر دوسری  
 طرف سے گیا تھا۔ شاید اسے معلوم نہ ہو سکا ہو۔ پولیس کہیں جاتی تھی تو  
 ہر طرف خبر پھیل جاتی کہ فلاں جگہ پولیس گئی ہے۔ ڈاکے اور قتل کی واردات  
 کی خبریں بھی اسی طرح پھیل کر تھیں۔ میں حیران تھا کہ پیر کو راسے  
 کے قتل کی اطلاع نہ ملی۔ اس سے مجھے شک ہوا کہ یہ اس قتل میں ملوث  
 ہے لیکن اُسی شام اُس کے خاص آدمی نے، جسے میں نے اپنا مخبر بنا  
 لیا تھا، مجھے بتایا کہ پیر کو واقعی معلوم نہ تھا کہ راما قتل ہو گیا ہے۔ لڑکی  
 کے فرار نے اسے باؤلا کر دیا تھا۔ وہ غصے میں تھا اور بے تماشہ شراب  
 پیتا رہا تھا۔ نئے میں دُھت ہونے کی وجہ سے وہ تھانے میں مجھ پر غصہ  
 جھاڑنے نہیں آیا تھا۔ نہ اُسے اتنا ہوش تھا کہ مجھے اپنے ہاں بلا کر  
 گلا کرے تاکہ میں نے اُس کی غیر حاضری میں اُس کی اجازت کے بغیر داخل  
 ہو کر اُس کے دربار کی بے ادبی کی ہے۔

راسے کھوجی کے قتل کی خبر سن کر اُس کا تاثر بدل گیا تھا۔ اُس

نہیں دیکھا کہ حضرت سلیمان کی اُمت (جنات) نیچے قرآن پڑھ رہی تھی۔  
 پھر میرے چار آدمیوں کو اپنے ساتھ لے گئے۔۔۔ یاد رکھو، اس علاقے  
 میں انگریزوں کی حکومت نہیں ہے۔ کہو تو ایسا جن پیچھے ڈال دوں کہ ساری  
 عمر تڑپتے گزار دو۔ خوش قسمت ہو کہ مسلمان ہو۔“

مجھے اس پر جو غصہ آیا اس کا آپ اندازہ نہیں کر سکتے لیکن میں  
 غصے کا اظہار نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس کی بجائے میں نے اس سے  
 معافی مانگی اور کہا۔ ”یاسر کار امیری نوکری کا سوال ہے۔ آپ کے قبضے  
 میں جن اور چڑھلیں ہیں۔ ان سے پوچھیں گھوڑی کہاں ہے۔ آپ کو  
 معلوم ہے کہ گھوڑی کا مالک بہت بڑا زمیندار اور حکومت کا آدمی ہے۔  
 میری رپورٹ کر دے گا اور میں مارا جاؤں گا۔“

اُس نے لمبا سانس لیا جو شاید اطمینان کا اظہار کیا تھا۔ اُس نے  
 گردن اڑالی اور آنکھیں کھول کر میری آنکھوں میں دیکھا۔ میرے سر  
 پر ہاتھ رکھ کر اپنے جلالی انداز میں بولا۔ ”پرسوں اسی وقت دربار میں  
 پھر حاضری دو۔ ہم تمہیں بتائیں گے گھوڑی کس کے پاس ہے۔۔۔“  
 جاؤ چلے جاؤ۔“

”نسر کار!“ میں نے جاہل قسم کے متعقدوں اور مریدوں کے  
 لہجے میں التجائی۔ ”دو باتیں اور بھی اپنے جنات سے پوچھنا۔ ایک یہ کہ  
 آپ کی چھت سے جو لڑکی رستے سے اُتر کر فرار ہوتی ہے وہ کہاں ہے  
 اور راسے کھوجی کا قاتل کون ہے؟“

چلایا اور اس طرح چلایا جیسے وہ رستے سے خود اتر کر فرار ہوتی ہے  
کیونکہ آپ جانتے تھے کہ اس لڑکی میں انگریزوں کا ایک سفید پوش  
اور زمیندار بھی دلچسپی لیتا ہے۔ آپ غلط کہتے ہیں کہ راسے کے قتل  
سے آپ بے خبر ہیں۔“

”یہ جھوٹ ہے۔“ وہ تڑپ کر بلبلا اٹھا۔ میں اُسے اسی کیفیت  
میں لانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اُس نے کہا۔ ”ملک صاحب! آپ  
اُس حرام خورد اور بچی گالیاں اکی باتوں میں آگئے ہیں۔ یہ الزام غلط ہیں  
جو آپ نے مجھ پر تھوپے ہیں۔“

”پھر سچ کیا ہے؟“ میں نے پوچھا۔ ”یہ الزام غلط ہیں تو صبح کیا  
ہے؟“ وہ سوچ میں پڑ گیا۔ وہ چونکہ مجرم ذہنیت کا آدمی تھا اس لئے  
اُس کے پاؤں اکھڑ گئے اور وہ اپنی اصلیت میں آنے لگا۔ گناہ چھوٹا  
سامعہ یا بہت بڑا، انسان کی اخلاقی جبرأت کو ختم کر دیتا ہے۔ میں  
نے اُسے رازداری کے لیے میں کہا۔ ”آپ جو کچھ بھی ہیں، میری نظر  
میں مسلمان ہیں۔ ہم کفرستان میں ہیں۔ اگر میں آپ کو مشتبه بنا کر تھالے  
بلالوں اور برآمدے میں بٹھا دوں تو ہندو، سکھ اور عیسائی ہمارے  
مذہب کا مذاق اڑاتیں گے اور کہیں گے کہ وہ دیکھو مسلمانوں کا پیر کس  
مُجرم میں تھانے بیٹھا ہے۔ میں آپ کے پاس اس طرح آیا ہوں جس  
طرح مرید آیا کرتے ہیں۔ میں جو پوچھتا ہوں صبح صبح بتا دیں میں آپ  
پر پردہ ڈالنے کی پوری کوشش کروں گا اگر آپ گول گول باتیں کر

وقت میں یہی سمجھا کر راسے کو اسی نے قتل کر لیا ہے۔ میں نے اسے  
گہری نظر سے دیکھا۔ اُس نے پھر اپنے اوپر جلال اور مراقبے والی کیفیت  
طاری کر لی۔ میں نے اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور ذرا سا ہلایا۔

## جنات غائب، پیر حاضر

”سرکار!“ میں نے کہا۔ ”جہوش میں آئیں۔ ہم دونوں ایک  
دوسرے کو اچھی طرح جانتے ہیں۔ اس نشے سے نکلیں کہ یہاں  
انگریزوں کی بادشاہی نہیں ہے۔ انگریز آپ کو اچھی طرح جانتے ہیں  
آپ کیا ہیں؟“

اُس نے آنکھیں کھول دیں اور عام آدمی کی طرح مجھے دیکھا۔ میں  
نے کہا۔ ”میں نے آپ کی عزت کی ہے کہ یہاں آگیا ہوں۔ میں آپ  
کو تھانے بلا سکتا تھا۔ انگریزوں کا ایک قیمتی کھوجی قتل ہو گیا ہے۔  
آپ نے ایک غریب ماں باپ کو ڈرا، اور غلام، انہیں لاپے دیتے  
اور دھوکے سے اُن کی کنواری بیٹی کو اپنے گھر میں جس بے جا پس رکھا۔  
وہ رُخ رہا تھا اور اُس کے چہرے پر رنگ آ اور جا رہے تھے۔ میں  
نے اُس کے پاؤں سے زمین نکالنے کے لئے کہا۔ ”میں جانتا ہوں،  
پولیس کپتان جانتا ہے کہ آپ کی اس درگاہ میں جو ان لڑکیوں کا کاروبار  
ہوتا ہے۔ آپ نے گورے رنگ اور نیلی آنکھوں والی لڑکی کو آگے

ساتھ کیا تعلق تھا اور کیا وہ بھاگی ہے یا یہ کوئی ڈرامہ تھا یا کیا تھا۔“

## پیر دول کے پیچھے

اُس نے بغلیں جھانکنے کی کوشش کی۔ انسانی فطرت کے مطابق اقبالِ جُرم کے ساتھ ساتھ پردہ پوشی کا عمل بھی جاری رکھنے کی کوشش کی لیکن میری اُستادی نے اُس کی زبان رواں کر دی۔ میں اُس کا سارا بیان آپ کو نہیں سنارہا کیونکہ یہ اصل کہانی سے بھی لمبا ہے۔ اس کے اہم حصے سنا دیتا ہوں۔ اُس کے الفاظ آج بھی میرے ذہن میں محفوظ ہیں اور میں اپنی سادہ لوح قوم کو بتانا چاہتا ہوں کہ اکثر پیر اسی قسم کے ہوتے ہیں۔ اُس نے کہا تھا۔ ”آپ جانتے ہیں کہ اس پیری مریدی کی حقیقت کیا ہے۔ لوگ مجبور اور بیوقوف ہوتے ہیں اور ہم چالاک اور نورس باز۔ جو پیری دعویٰ کرتا ہے کہ اُس کے قبضے میں جن ہیں اُسے میرے سامنے بھاڑیں۔ میں اُسے بتاؤں گا کہ ایسے ہی جن میرے قبضے میں بھی ہیں۔ یہ سب دھوکہ بلکہ نظر کا دھوکہ ہے۔۔۔ اور اولاد دینے والے پیر بے اولاد عورتوں کو جو اولاد دیتے ہیں وہ اولاد دعاؤں یا تعویذوں کی نہیں وہ پیر کی ہوتی ہے۔ لوگ اتنے احمق ہیں کہ یہ بھی نہیں دیکھتے کہ اولاد دینے والا پیر صرف عورت پر عمل کرتا اور اُسی کو تعویذ دیتا ہے، وہ خاوند کے

کے مجھے ٹانے کی کوشش کریں گے تو آپ کی عزت کرنا چاہوں تو بھی نہیں کر سکوں گا۔ میری ڈلیوٹی ٹی ہی ایسی ہے۔“ میں نے اور آگے جھٹک کر کہا۔ ”اور میں یہ بھی جانتا ہوں کہ سرکار اندر سے کیا ہیں میں اُس وقت اس درگاہ پر چھاپہ ماروں گا جب آپ نشتے میں بدست ہوں گے اور آپ کے گھر سے وہ عورتیں برآمد ہوں گی جنہیں اس گھر میں نہیں ہونا چاہیے۔ انگریز خود بدکار قوم ہے اس لئے بدکاروں کو پہچانتی ہے۔“

”ارے چپ ہو جا تو ملک بھاتی۔“ اُس نے میرا ایک ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں پکڑ لیا اور دوستانہ بے تکلفی سے بولا۔ ”میرا تعلق صرف اس لڑکی کے ساتھ تھا۔ وہ سالی بھاگ گئی ہے۔ مجھے شک ہے اس زمیندار نے اُسے بھگایا ہے۔“

”مجھے اس لڑکی کے ساتھ کوئی دلچسپی نہیں ہے۔“ میں نے کہا۔ ”مجھے زمیندار کی گھوڑی کے ساتھ بھی دلچسپی نہیں رہی۔ تحقیقات ہوتی رہے گی گھوڑی نہ ملی تو کیس عدم پتہ کر کے داخل دفتر کر دوں گا۔ مجھے رائے کا قائل چاہیے مشکل یہ پیدا ہو گئی ہے کہ رام گھوڑی اور چور کا کھڑا اٹھاتے قتل ہوا ہے، اور آپ کے پچھوڑے کی دیوار پر جو نشان ہیں اور لڑکی کا جو کھڑا ہے، وہ صاف بتاتا ہے کہ وہ چوری کی گھوڑی پر گئی ہے، اس لئے مجھے گھوڑی اور لڑکی کے متعلق بھی معلوم کرنا ہے کہ وہ کہاں ہیں۔ آپ مجھے بتائیں کہ آپ کا اس لڑکی کے

ساتھ کوئی سروکار نہیں رکھتا۔ اُس کی دلچسپی صرف عورت کے ساتھ ہوتی ہے۔“

اُس نے نیلی آنکھوں والی لڑکی کے ساتھ جس طرح تعلق پیدا کیا تھا وہ بھی تفصیل سے سُنا۔ اُس نے جھوٹ نہیں بولا۔ لڑکی کے باپ اور اُس کی ماں نے جس طرح بیان دیتے تھے، پیر نے اسی طرح اپنا بیان دیا۔ اُس نے زمیندار کا بھی ذکر کیا۔ ”لڑکی اس قدر ہوشیار نکلی کہ ہاتھ نہیں آتی تھی۔“ اُس نے کہا۔ ”میں نے اپنے کمرے میں لے جا کر اُسے اپنے عمل کی جادوگری سے زیر کرنے کی کوشش کی تھو وہ زندہ مچھلی کی طرح میرے ہاتھ سے پھسل کر نکل گئی۔ کہنے لگی یہ جادو کسی اور پر چلانا۔ میں ایسی ہوتی تو بڑے بڑے خوبصورت اور امیر آدمی میرے پیچھے پھرتے ہیں۔ میں کسی پر لعنت بھی نہیں بھیجتی اور وہ میرے ہاتھ سے نکل گئی۔۔۔ اُس کے ماں باپ کو ڈرا یا دھمکا یا تو ایک روز وہ اُسے میرے پاس لے آئے۔ میں اُسے اندر لے گیا اور اُسے کہا کہ میری نیت بُری نہیں۔ میں نے دوسرے کمرے میں جا کر کھڑو فارم کی شیشی نکالی۔ چند قطرے رومال پر ڈالے۔ رومال چھپا کر لایا۔ لڑکی میرے پٹنگ پر بیٹھی تھی۔ رومال اس کی ناک پر رکھ دیا۔ وہ فوراً بے ہوش ہو گئی۔“

اُس کے ماں باپ دوسرے کمرے میں بیٹھ تھے۔ پیر نے انہیں اسی طرح چلتا کیا جس طرح ان دونوں نے مجھے سنایا تھا۔ پیر نے

اپنے بیان میں کہا۔ ”لڑکی شام سے فوراً پہلے ہوش میں آتی۔ اُس نے اُدھم مچا دیا۔ کتنی ڈھنگ کھیل کر اُسے خاموش کرایا۔ بعد میں ڈرا یا لاپٹے دیتے دھمکیاں دیں مگر اُس پر کچھ اثر نہ ہوا۔ میری خاص مرید نیوں میں ایک خزانٹ اور استاد عورت ہے، اُسے بلایا اور کہا کہ اسے رام کرو۔ میں نے لڑکی کے کمرے میں جانا چھوڑ دیا۔ لڑکی اس عورت کی تحویل میں رہی۔ سات آٹھ روز گزر گئے۔ اس عورت نے مجھے خوشخبری سنائی کہ لڑکی نرم ہو رہی ہے اور مجھے قبول کر لے گی، مگر ایک صبح مجھے بتایا گیا کہ لڑکی غائب ہے اور بچھوڑے ایک رستہ لٹک رہا ہے۔ میں نے جا کر دیکھا۔ رستہ لٹک رہا تھا۔ اوپر کا سرائٹھی سے بندھا تھا۔“

”میں اس عورت سے ملنا چاہتا ہوں۔“ میں نے کہا۔

”وہ بھی چلی گئی ہے۔“ اُس نے جواب دیا۔ ”اس میں کوئی شک نہیں کہ لڑکی کو اُسی نے بھگایا ہے۔ اگر وہ یہاں رہتی تو میں اُسے زندہ بچھوڑتا۔“

”میں کیسے یقین کروں کہ وہ خود غائب ہوئی اور اُسے آپ نے مروا نہیں دیا؟“ میں نے پوچھا۔ ”وہ کہاں کی رہنے والی تھی؟“

”ایسی عورتیں کہیں کی بھی رہنے والی نہیں ہوتیں۔“ اُس نے جواب دیا۔ ”اُس کا پیشہ ہی یہی تھا، لڑکیوں کو درغلانا اور مرید نیوں میں اضافہ کرنا۔ یہ عورت دو سال سے میرے پاس تھی۔ ہر ڈھنگ کھیلنا جانتی تھی۔ چوروں اور ڈاکوؤں کے لئے گھر بھیدی کا کام کرتی تھی۔“

میرے پاس آتی تو میں نے اُسے اپنے پاس رکھ لیا۔ اُس نے باہر اپنا کاروبار بھی جاری رکھا اور میرے کام بھی کرتی رہی۔ مجھے بالکل علم نہیں کہ کہاں کی رہنے والی ہے۔“

## یہ عورت بھی گئی

اس عورت کی اب مجھے مزرورت تھی۔ میں نے پیر سے بہت پوچھ چوک کی لیکن وہ جو کچھ بتا چکا تھا اس سے زیادہ اُس سے کچھ اور معلوم نہ ہو سکا۔ صرف ایک چیز اُس نے مجھے اندر سے منگو کر دے دی۔ پیر سے تھا جس سے نیلی آنکھوں والی لڑکی چھت سے اُتری تھی۔ پیر نے بتایا کہ یہ رستہ اُس کے گھر کا نہیں باہر سے آیا ہے۔ یہ شاید اسی مقصد کے لئے لایا گیا تھا۔ یہ عورت اس واردات کا نثار تھا۔ میرے دماغ میں یہی آتا تھا کہ یہ عورت اس لڑکی کو اڑا لے گئی ہے اور کسی امیر کبیر آدمی یا کسی راجے مہاراجے کے ہاتھ بیچ ڈالی ہے۔ میرے سامنے سب سے زیادہ پیچیدہ سوال یہ تھا کہ اس لڑکی اور اسے بھگالے جانے والی عورت کا بیچیا کروں یا اسے کھوجی کے قاتل تک پہنچنے کا کوئی اور راستہ اختیار کروں؟ مجھے اب یہ نظر آنے لگا تھا کہ گھوڑی اس لڑکی کو بھگالے جانے کے لئے چراتی گئی ہے۔ پیر نے یہ بات صاف کر دی تھی کہ یہ عورت چوروں اور ڈاکوؤں کے لئے کام کرتی تھی۔ میں

اچھی طرح جانتا تھا کہ ایسی عورت میں جرائم پیشہ گروہوں کے لئے کیا کام کرتی ہیں اور کس طرح کرتی ہیں۔

میں جب پیر کے گھر سے نکلا تو اُس کا وہ خاص آدمی جس نے مجھے پیر کے گھر کے راز دیتے اور میرا مخبر بن گیا تھا، باہر کھڑا تھا۔ وہ میرے انتظار میں تھا۔ میں اُسے اشارہ کر کے چلا گیا۔ وہ دوڑ کا پتھر کاٹ کر مجھے راستے میں ملا۔ میں نے اُس سے پوچھا کہ اُس نے مجھے یہ کیوں نہیں بتایا تھا کہ لڑکی ایک برعاش عورت کی تحویل میں رہی ہے اور وہ عورت بھی لڑکی کے ساتھ ہی غائب ہو گئی ہے؟ اُس نے یہ نہ بتانے کی کچھ وجوہات بتائیں جو کچھ ایسی ویسی ہی تھیں۔ البتہ اُس نے یہ کہا کہ اُسے بالکل علم نہیں تھا کہ لڑکی اس عورت کی تحویل میں ہے۔ یہ بند کمروں کی باتیں تھیں جو اس آدمی کو معلوم نہیں تھیں۔

”یہ تو آپ کہتے ہیں کہ آپ پیروں کی اصلیت جانتے ہیں؟“ اس نے کہا۔ ”لیکن اس پیر کی حویلی کے اتنے کمرے ہیں اور اس کے پاس ایسے ایسے آدمی اور عورتیں ہیں کہ خود پیر کو معلوم نہیں کہ اس کے گھر میں کیا ہوتا ہے۔“

میں نے اس آدمی سے اس عورت کے متعلق پوچھا۔ اُس نے بھی وہی باتیں بتائیں جو پیر بتا چکا تھا۔ اُسے بھی معلوم نہیں تھا کہ یہ عورت کہاں کی رہنے والی تھی۔ اسے یہ یقین تھا کہ یہ عورت جرائم پیشہ گروہوں سے تعلق رکھتی تھی اور بہت ہی چالاک عورت تھی۔ پیر کو بھی انگلیوں



پر سچا لیتی تھی .... اس آدمی کے پاس اور کوئی نئی خبر نہیں تھی۔ اسرار کی اطلاع کے مطابق ان دو تین دنوں میں پھر کہیں باہر نہیں گیا تھا نہ کوئی مشکوک آدمی اس کے پاس آیا تھا۔ پیر غصے میں شراب چڑھاتا اور گالیاں بکتا رہا تھا۔

## قتل کی کہانی پھر سنی

میں شام کے بعد تھانے میں بیٹھا خیالوں میں سر پٹخ رہا تھا۔ یہ ایسی واردات معلوم نہیں ہوتی تھی جس کی تفتیش میسر ہی اپنی ہی سراغ رسانی سے مکمل ہو جاتی۔ مجھے اب مجبوروں کا سہارا لینا تھا پیر اور زمیندار کو بھی میں خطر اندازہ نہیں کر سکتا تھا۔ مجھے اندھیرے میں فرش پر گرہی ہوتی سوتی تلاش کرنی تھی۔ عثمان آگیا۔ مجھ پر گہری سوچ اور شاید افسردگی طاری تھی۔ عثمان مسکراتا ہوا آیا۔ وہ میرے دل کا حال جانتا تھا اور میری ذمہ داریوں کو بھی سمجھتا تھا۔ اُسے معلوم تھا کہ میں کس مشکل میں پھنس گیا ہوں۔ شہروں میں قتل کی جو وارداتیں ہوتی ہیں ان کا سراغ لگالیا جاتا ہے۔ رات سڑک پر بڑی ہوتی لاش ملے تو اُس کے وارثوں کو تلاش کر کے اُس کے قاتل کو بھی پکڑا جاسکتا ہے مگر میرے سامنے ایسی واردات تھی جس کی تفتیش کے تمام راستے اندھیروں میں جا کر ختم ہو جاتے تھے۔ اگر رائے کھوجی کو

کسی جہاں ہم پیشہ گروہ نے قتل کیا تھا تو یہ کون سا گروہ تھا؟ سہارا صرف مجبوروں کا لینا تھا مگر یہ خطرہ موجود تھا کہ مجبور دو غلے تھے۔ سب سے بڑا خطرہ یہ تھا کہ انگریز ڈی۔ ایس۔ پی کا دورہ آٹھ دس روز تک متوقع تھا۔

میری اس پریشانی کو جانتے ہوئے عثمان مسکراتا ہوا آیا جیسے ہم نے تفتیش کامیابی سے مکمل کر کے طریم پکڑ لے ہوں۔ اُس نے میرے سامنے بیٹھ کر کہا۔ ”جناب عالی! نیلی آنکھوں والی لڑکی خدا نے آپ کی سختی پر کبھی ہی نہیں۔ یہ تفتیش مجھے آزادی سے کرنے دیں۔ ہاتے گورے گورے گال اور نیلے نیلے نہیں“

اپنی زندگی کی وہ شام مجھے آج تک یاد ہے۔ عثمان کی مسکراہٹ میری آنکھوں کے سامنے ہے۔ اُس کا طفلانہ سا انداز بڑا ہی پیارا ہوا کرتا تھا۔ اس پریشانی کے عالم میں عثمان کا یہ مذاق مجھے بُرا نہ لگا، بلکہ اچھا لگا۔ اعصاب تھک چکے تھے۔ میں اُس وقت بوڑھا نہیں تھا۔ میں نے عثمان کو چھیڑ دیا تاکہ وہ اور زیادہ مذاق کرے۔ میں نے اُسے کہا۔ ”یار عثمان! سچی پوچھو تو اس وقت مجھے نیلی آنکھوں والی لڑکی چاہیے۔“

”قتل ہو جاؤ گے ملک صاحب!“ اُس نے کہا۔ ”اخباروں میں خبر چھپے گی، ایک اے۔ ایس۔ آئی نے اپنے ایس۔ ایچ۔ او کو قتل کر دیا ہے۔“

سی ہنسی ہنس پڑا۔ میں نے کہا ”شرفو! تاقولوں کا کچھ پتہ نہیں چل رہا۔ ہم کدکشی کر رہے ہیں کہ تمہیں کوئی چہرہ یاد آجائے سناؤ، کیا ہوا تھا؟“ اُس نے ساری بات ایک بار پھر سنا دی۔ عثمان نے مجھے گہری نظروں سے دیکھا۔ اُس نے بھی وہی محسوس کیا تھا جو میں نے کیا تھا۔ اشرف علی کے تین بیانیوں میں کچھ فرق تھا۔ ایک بار اُس نے کہا کہ اُس کے تعاقب میں تین آدمی دوڑے۔ دو بار اُس نے دو کہے۔

”راے پر چاروں نے ڈنڈے برسائے شروع کر دیتے تھے؟“

— میں نے پوچھا۔

”جی۔ چاروں نے“

”تم کہتے ہو ان میں سے ایک نے تمہاری طرف اشارہ کر کے کہا تھا کہ اسے بھی ختم کر دو“ میں نے پوچھا۔ ”تم اُسی وقت بھاگے تھے یا راے پر ڈنڈے پڑنے سے پہلے یا بعد؟“

”انہوں نے جوں ہی راے پر حملہ کیا میں بھاگ اُٹھا۔ اُس نے جواب دیا۔

”تم نے دوڑتے دوڑتے سنا تھا کہ حملہ آوروں میں سے ایک نے کہا کہ اسے بھی ختم کر دو؟“ میں نے پوچھا۔

”جی۔ میں دوڑ رہا تھا۔“

”تمہیں اشارہ کیسے دکھائی دیا؟“ میں نے پوچھا۔ ”تم نے کیسے جانا کہ اس آدمی نے تمہاری طرف اشارہ کیا تھا؟“

کچھ دیر گپ شپ چلی جو آہستہ آہستہ واردات پر آگئی۔ عثمان اتنا ہی بنجیدہ ہو گیا جتنا میں تھا۔ واردات کے مختلف پہلوؤں پر بات کرتے کرتے ہم دونوں پریشان ہی ہوتے گئے۔ عثمان نے کہا ”شرفو کو ملا کہ ایک بار پھر پوچھتے ہیں کہ راکس طرح قتل ہوا تھا۔ وہ عقل مند کانسٹیبل ہے۔ اسے کہیں گے کہ وہ اُس وقت کو اپنی آنکھوں کے سامنے لاتے اور یاد کرے کہ وہ چاروں آدمی قہرے کیسے تھے۔ اسے شاید کوئی کام کی بات یاد آجائے۔ شرفو نے بتایا ہے کہ ان چاروں کے پاس ڈنڈے تھے۔ شرفو جھوٹ نہیں بولتا۔ ڈنڈے ہی ہوں گے لیکن ملک صاحب! اگر وہ مینا یا بسا کھے کے یا کسی ایسے ہی جراثیم پیشہ گروہ کے آدمی ہوتے تو ان کے پاس خنجر، چاقو، برچیاں، یا تلواریں ہوتیں۔ آپ جانتے ہیں کہ ان کے پاس پستول اور بند توئیں بھی ہیں۔ ان میں سے کوئی ایک یادو آدمی چپ کر شرفو کانسٹیبل کو بھی راے کھوجی کے ساتھ ختم کر سکتے تھے۔ مجھے شک ہے یہ کسی جراثیم پیشہ گروہ کے آدمی نہیں تھے۔“

میں نے اشرف علی کانسٹیبل کو ملا کہ اپنے پاس بٹھایا اور اُسے کہا کہ وہ راے کھوجی کے قتل کا آنکھوں دیکھا حال ایک بار پھر سناتے اور ذہن پر زور دے کر یاد کرے کہ وہ کیسے تھے۔ اُس نے ایک بار سنائی ہوئی کہانی ایک بار پھر سنا دی۔ میں نے اُسے کہا ”شرفو! یہی کہانی ایک بار پھر سناؤ“ میں نے اُس کے چہرے پر تبدیلی سی دیکھی۔ وہ کھسیانی

”جی۔ دو گھنٹے۔“  
 ”سیدھے گاؤں میں گئے تھے یا دور کا چکر کاٹ کر؟“ عثمان  
 نے پوچھا۔  
 ”سیدھا گیا تھا۔“  
 ”اگر تم سیدھے گئے تھے اور مسلسل دو گھنٹے دوڑتے رہے تھے  
 تو تم دس میل دور چلے جاتے۔“ عثمان نے کہا۔ ”وہ گاؤں وہاں سے  
 صرف ڈیڑھ میل دور ہے۔“  
 ”اس سے آدھا وقت دوڑ کر تم سیدھے یہاں پہنچ سکتے تھے۔“  
 — میں نے کہا۔

”تمہارے تعاقب میں کتنے آدمی دوڑے تھے؟“ عثمان نے  
 پوچھا۔ ”اچھی طرح یاد کر لو۔“  
 اُس نے کوئی جواب نہ دیا۔ میری طرف دیکھنے لگا۔ اس کے بعد  
 عثمان نے اور میں نے اُس پر اس طرح سوال کرنے شروع کر دیے  
 جیسے تیر چلا تے جاتے ہیں۔ یہ پوچھ گچھ کا خاص طریقہ ہوتا ہے۔ شرف  
 نے شک پیدا کر دیا تھا۔ ہم ایک ایک سوال گھما پھرا کر کئی کئی بار کرتے  
 تھے۔ عثمان اٹھا اور اشرف علی کے پیچھے کھڑا ہو گیا۔ اشرف علی کے سر  
 پر پگڑی تھی۔ وہ کسی سوال کا جواب دے رہا تھا کہ عثمان نے اُس کی  
 پگڑی سر سے اتار کر پھینک دی۔ اُس کے بالوں کو مٹھی میں لے کر  
 زور سے اوپر کھینچا۔ اشرف علی اٹھا۔ عثمان نے جھکا دے کر اُسے اپنی

”وہاں میں ہی تھا۔“ اشرف علی نے جواب دیا۔ ”اُس نے اشارہ  
 ضرور کیا ہو گا۔“  
 ”دیکھو شرفو!— میں نے کہا۔“ تم پرانے کانٹیل ہو۔ سب باتیں  
 سمجھتے ہو۔ وہ رائے کو ختم کر کے تمہارے پیچھے دوڑے ہوں گے۔  
 اتنی دیر میں تم بہت دور نکل گئے ہو گے۔ تم نے مجھے اپنے بھاگنے  
 کا جو راستہ دکھا یا تھا وہاں چٹانیں تھیں۔ اتنی دیر میں تم چٹانوں میں چلے  
 گئے تھے۔ اس کی وضاحت کرو۔ شاید میں سمجھنے میں غلطی کر رہا ہوں۔“

## اشرف علی شکنجے میں

اُس نے جو جواب دیا اس سے میں مطمئن نہ ہوا بلکہ عثمان نے  
 چونک کر میری طرف دیکھا۔  
 ”رائے پر حملہ کتنے بجے ہوا تھا؟“ عثمان نے پوچھا۔  
 ”تین اور چار بجے کے درمیان۔“  
 ”تم اُس گاؤں میں کب پہنچے؟“ عثمان نے تیزی سے پوچھا۔  
 ”جمع جواب دینا۔ ہم نمبر دار سے پوچھ لیں گے۔“  
 ”سورج غروب ہونے کے بعد۔“ اشرف علی نے جواب دیا۔  
 ”گویا تم دو گھنٹے سے کچھ زیادہ وقت دوڑتے رہے۔“ میں  
 نے کہا۔

اشرف علی ہدایت سہاجت کرنے لگا۔ عثمان نے اُس کا مُنہ کھنکھایا اور ڈنڈا درمیان سے اس کے مُنہ میں رکھ دیا۔ ڈنڈے کے دونوں سرے فرش سے اُٹنے ہی اُونچے تھے جتنا اشرف علی کا مُنہ اُونچا تھا عثمان نے ایک پاؤں ڈنڈے کے ایک سرے پر اور دوسرا دوسرے پر رکھ کر دباؤ ڈالا۔ ڈنڈا اشرف علی کے ہونٹوں کے کونوں کو کاٹنے لگا۔ وہ بُری طرح سڑا۔ ایک کانٹیل اُس کی رانوں پر کھڑا ہو گیا اور دوسرے نے اپنی ٹانگیں پھیل کر اس کے ہاتھوں پر پاؤں رکھ دیئے۔ یہ بڑی ہی ظالمانہ اذیت ہوتی ہے۔

### لڑکھانڈوں سے نکلنا

تین چار منٹ بعد عثمان نے اُس کے مُنہ سے ڈنڈا نکالا اور پوچھا ”بولو گے؟“ شرف نے ہاں میں سر ہلایا۔ اُسے اُٹھایا گیا۔ اُس نے کہا ”انہیں (کانٹیلوں کو) باہر بھیج دو۔“ دونوں باہر چلے گئے۔ ”وعدہ معاف گواہ بنا لو۔“ اشرف علی نے کہا۔

”بنالیا۔“ میں نے کہا۔

”دھوکا تو نہیں ہوگا؟“ اس نے پوچھا۔

عثمان نے پوری طاقت سے اُلٹا ہاتھ اُس کے منہ پر مارا۔ وہ پیچھے دیوار سے جا لگا۔ عثمان نے اسے گالی دے کر کہا ”تم ہمیں اپنے جیسا

طرف کیا اور اُس کے ٹخنوں پر اپنا پاؤں مار کر یا اڑنگو سے کر اشرف علی کو فرش پر ایسا گرایا کہ وہ چاروں شانے چت گرا۔ اس کے ساتھ ہی عثمان نے دو کانٹیلوں کو آواز دی۔ فوراً ہی عثمان اشرف علی کے سینے پر کھڑا ہو گیا۔

میں تشدد کا قائل نہیں تھا۔ میں نے اُٹھ کر عثمان کا بازو پکڑا۔ عثمان نے سخت غصے میں اپنا بازو چھڑایا اور مجھے دھکے دے کر غضب ناک آواز میں بولا۔ ”پیچھے رہو ملک صاحب! آپ کی شرافت ہمیں بہت خراب کر چکی ہے۔ آپ ہفتوں سزا فرسانی کرتے رہیں گے، میں پانچ منٹ میں آپ کو رائے کے قائل کا نام پتہ بتا دوں گا۔“ اُس نے اشرف علی کے سینے پر اُچھلتے ہوئے اُسے گالی دی اور پوچھا۔ ”فوراً بول اور تے! میں جب گھوڑی کی چوری کے موقع پر جانے کے لئے دوسرے کانٹیلوں کو ساتھ لے جا رہا تھا تو تم نے آگے ہو کر کیوں کہا تھا کہ میں جاؤں گا۔۔۔ اور جب میں رائے کھوجی کے ساتھ دوسرے کانٹیل کو جانے کے لئے کہہ رہا تھا تو تم نے کیوں کہا تھا کہ رائے کے ساتھ میں جاؤں گا۔۔۔ ملک صاحب! میرے قریب نہ آنا۔“

میں الگ کھڑا ہو گیا۔ اتنے میں وہ دو کانٹیل آگے جنہیں عثمان نے آواز دی تھی۔ یہ اذیت رسانی کے ماہر تھے۔ میرے دفتر میں گزرا ہوا ڈنڈا پڑا تھا۔ عثمان نے کہا، یہ ڈنڈا ادھر لاؤ۔ ڈنڈا اُس کے ہاتھ میں آیا تو عثمان نے اشرف علی کے سینے سے اتر کر اُسے کہا۔ ”مُنہ پورا کھول دو۔“

سمجھتے بنو۔ ملک صاحب نے کہ نہیں دیا تمہیں سلطانی گواہ بنا لیا ہے کرسی پر بیٹھو۔ کاغذ قلم و دو ملک صاحب! میں بیان لکھتا ہوں۔  
 ”راے کھوجی کو میں نے قتل کیا ہے۔“ اشرف علی نے کہا۔  
 ”تمہاری اپنی دشمنی تھی یا کسی اور کے لئے قتل کیا ہے؟“  
 میں نے پوچھا۔

”مینا کے لئے۔“ اُس نے جواب دیا۔

”اب پوری بات سناؤ۔“ میں نے کہا۔ ذرا سی بھی گڑبڑ ہوتی تو وعدہ معاف گواہ نہیں بن سکو گے اور پچھانی چڑھ جاؤ گے۔“

اُس کے بیان اور ہماری جرح سے اُس کا جو بیان بنا وہ یہ تھا: مینا ایک اشتہاری اور پیشہ ور رہزن اور دُکیت تھا۔ اُس زمانے میں ایسے افراد کو ٹھگ کہا کرتے تھے۔ مینا بڑی اچھی شکل و صورت اور چھپرے سے بدن والا آدمی تھا۔ وہ زندہ دل اور شگفتہ مزاج بھی تھا۔ اُسے دلچھ کر کوئی کہہ نہیں سکتا تھا کہ یہ شخص اتنا خطرناک مجرم ہے۔ راے کھوجی کے قتل کے وقت اُس کی عمر میرے اندازے کے مطابق پچیس پینتیس سال تھی۔ وہ قتل اور ڈاکے کی متعدد وارداتوں میں ملوث تھا۔ میں اُس وقت تک مخبروں کی اطلاع پر تین چھاپے مار چکا تھا لیکن ہر بار مینا نکل گیا تھا۔ اُسے پولیس کے چھاپے کا قبل از وقت پتہ چل جاتا تھا۔ اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ ہمارے منجہ و دخل کے دار ادا کرتے تھے اور دوسری وجہ یہ کہ اُس کے اپنے مخبر پولیس پر نظر رکھتے تھے۔

مینا نے یہ کمال کر دکھایا کہ میرے ایک کانٹیل کو اپنا باقاعدہ مخبر بنا رکھا تھا۔ یہ اشرف علی تھا جسے میں اور عثمان قابل اعتماد اور عقلمند کانٹیل سمجھتے تھے۔ اشرف علی اڑھائی سال سے اُس کے لئے مخبری کر رہا تھا۔ اُس نے اپنے بیان میں اعتراف کیا کہ میرے دو چھاپوں کی قبل از وقت اطلاع اسی نے مینا تک پہنچائی تھی۔ اشرف علی کو اس کا بہت معاوضہ ملتا تھا۔ گھوڑی کی چوری اور راے کھوجی کے قتل سے چند دن پہلے اشرف علی پانچ روز کی چھٹی گیا تھا۔ اس نے اقبال جرم میں بتایا کہ وہ مینا کے پاس اُس کے بلاوے پر گیا تھا۔ اُس نے اُس گاؤں کا نام بتایا جہاں مینا کچھ دیر کے لئے ٹھہرا تھا۔

مینا نے اُسے ایک کام سونپا۔ یہ اس واردات کا دلچسپ پہلو ہے۔ جن دنوں زمیندار شکار پر گیا تو نیلی آنکھوں والی لڑکی کے گاؤں سے گزرتے اُس کی نظر لڑکی پر پڑی تھی اور وہ اُس کے گھر چلا گیا تھا۔ مینا دنوں مینا نے اُدھر سے گزرتے اُس لڑکی کو دیکھا تھا۔ مینا نے اشرف علی کو بتایا تھا کہ لڑکی نے اُس کے پاؤں جکڑ لئے۔ وہ اُس وقت گاؤں سے کچھ دُور لڑکیوں کے ساتھ اُدھر اُدھر بھاگ دوڑ رہی تھی۔ اُس نے لڑکی کو بلایا۔ نام پوچھا۔ ان کے درمیان رسمی سی باتیں ہوئیں۔ مینا نے محسوس کر لیا کہ لڑکی نے مجھ سے پسند کر لیا ہے۔ دوسرے دن مینا پھر اُدھر گیا۔ وہ لڑکی کو بتا گیا تھا۔ لڑکی وہاں کھڑی تھی۔ اُس روز لڑکی نے مینا کی محبت قبول کر لی اور اپنی محبت کا اظہار کر دیا۔ مینا اُسی روز لڑکی کو اپنے

ساتھ لے جاتا لیکن مینا کو کہیں اور جانا تھا۔

لڑکی کے دل کا راز مینا

چلا کہ لڑکی پر حکیم صاحب کے گھر ہے۔ پیر کے گھر ایک عورت بھی جس کی زندگی جراثیم میں گزر رہی تھی۔ اُس نے مینا کے لئے بہت کام کیا تھا۔ مینا کو معلوم تھا کہ یہ عورت پیر کے گھر ہے۔ رابٹل کے کئی ذرائع تھے۔ مینا نے اس عورت کو پیغام بھیجا کہ لڑکی کو وہاں سے نکالو۔

اس عورت کے لئے یہ کام مشکل نہیں تھا۔ پیر کے گھر مردوں اور مریدنیوں کی آمد و رفت رہتی تھی۔ مینا نے اشرف علی کے ہاتھ رتہ بھجوا دیا کیونکہ عورت نے پیغام بھیجا تھا کہ لڑکی کو رات کو نکالا جاسکتا ہے اور وہ بھی رستے کی مدد سے۔ ڈیوڑھی میں تین چار آدمی سوتے ہوئے تھے۔ لڑکی فرار کے لئے تیار تھی۔ وہ مینا کی محبت میں گرفتار ہو چکی تھی۔ مینا کے آدمیوں نے عورت کے ساتھ رابطہ رکھا اور ایک رات طے کر لی گئی۔ پہلے زمیندار کی گھوڑی کھولنی تھی لیکن گھوڑی بند دروازے کے پیچھے ہوتی تھی۔ اندر ایک لوکر سوتا تھا۔ لوکر کو ڈیڑھ سو روپیہ (جو آج کے تین ہزار روپے کے برابر تھا) دیا گیا اور یہ وعدہ بھی کہ اُسے اگر زمیندار نے لوکر کی سے نکال دیا تو اُس کے روزگار کا اس سے اچھا انتظام کر دیا جائے گا۔ لوکر کا کام صرف یہ تھا کہ رات دروازے پر بیٹھی سی دنگ ہو تو وہ دروازہ کھول دے۔

چونکہ اس ساری سیکیم کا ڈائریکٹر مینا تھا، اور مینا جراثیم پیشہ تھا اس لئے سیکیم کی ہر ایک کڑی پر نہایت خوبی سے عمل ہوا۔ گھوڑی کھولنے کے لئے ایک آدمی گیا۔ لوکر نے دروازہ کھول دیا۔ گھوڑی بغیر زین کے

اشرف علی کو مینا نے بتایا کہ ایک زمیندار (جس کی گھوڑی چوری ہوتی تھی) اور پیر حکیم صاحب بھی اس لڑکی کو بچانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ یہ دونوں لڑکی کے گھر جانے لگے تھے۔ مینا نے اپنے کسی آدمی کو زمیندار کے پاس یہ پیغام دے کر بھیجا کہ تم مینا کے دل پر ہاتھ ڈالنے کی کوشش نہ کرو۔ اگر تم لڑکی کے گھر جانے سے باز نہ آتے تو کسی کو پتہ بھی نہیں چلے گا کہ تمہیں کون قتل کر گیا ہے۔ زمیندار نے اس دیکھی کا جواب یہ دیا کہ چوروں کی طرح قتل کرنا مردوں کا کام نہیں، میرے سامنے آؤ۔ یہ جواب سن کر مینا نے اپنے دو آدمیوں سے کہا کہ جب میں کہوں اس لڑکی کو اس زمیندار کی گھوڑی پر سوار کرا کے لانا۔

مینا تین چار بار رات کے وقت لڑکی کے گاؤں گیا۔ لڑکی کو اشارہ معلوم تھا۔ مینا بیٹھنے کی لمبی آواز نکالتا تھا جس سے لڑکی باہر آ جاتی اور مینا سے ملتی تھی۔ اشرف علی کے اس انکشاف سے یہ راز کھلا کہ لڑکی کے مال باپ کے بیان کے مطابق لڑکی تین چار بار رات کو باہر گئی اور دیر سے واپس آتی تھی۔ اُن کا خیال تھا کہ وہ زمیندار سے ملنے جاتی ہے۔ مینا کو کہیں دُور جانا پڑا۔ اشرف علی کو معلوم نہیں تھا کہ مینا کہاں گیا۔ وہ واپس آیا تو اُسے پتہ

کو معلوم تھا کہ گزشتہ رات گھوڑی اور لڑکی نکالی جاتے گی۔ وہ اپنی ڈیوٹی پوری کرنے کے لئے براہِ آمد میں کھڑا تھا۔ اس کی توقع کے مطابق زمیندار آگیا۔ اشرف علی نے وردی پہن لی تھی۔ عثمان نے دو کانٹیلوں کو بلایا تو اشرف علی نے آگے بڑھ کر کہا کہ میں جاؤں گا۔ یہ زمین اور ہوشیار سپاہی تھا۔ عثمان نے اسی کو ساتھ لے جانا پسند کیا۔ عثمان رائے کھوجی کو بھی ساتھ لے گیا تھا۔

رائے کھوجی نے نہایت کامیابی سے کھڑا اٹھایا۔ اشرف علی کے بیان کے مطابق گاؤں سے باہر ایک آدمی کھڑا تھا۔ دوسرا آدمی نوکر کی مدد سے گھوڑی لے آیا اور باہر جو آدمی کھڑا تھا وہ گھوڑی پر سوار ہو گیا۔ آپ ایک بار پھر پڑھیں کہ رائے کھوجی نے کیسے کھڑا اٹھایا اور عثمان کو کیا بتایا تھا۔ وہ حرف بہ حرف صحیح نکلا۔ گھوڑی کو گاؤں سے دواڑھائی فرلانگ دُور دُور سے پیر حکیم صاحب کی بستی تک لے جایا گیا۔ ایک آدمی لے آؤں کی آواز نکالی۔ چھت کی ٹمٹی کے ساتھ رتہ بازہا جاچکا تھا۔ عورت اور لڑکی چھت پر تھیں۔ لڑکی رستے سے اُتر آئی اور بتاتی ہوئی جگہ پر پہنچ گئی جہاں گھوڑی کھڑی تھی۔ اشرف علی کو یہ معلوم نہیں تھا کہ اس عورت نے لڑکی کے جانے کے بعد رتہ کیوں نہیں اُتارا اور وہ خود اس گھر سے کس وقت اور کس طرح نکلی اور غائب ہو گئی۔

اشرف علی نے اپنے بیان میں بتایا کہ جب میں عثمان کے بلانے

نکال لی گئی۔ کانٹیل اشرف علی چٹھی سے واپس آچکا تھا۔ اس سکیم میں اشرف علی کے ذمے یہ کام تھا کہ اگر زمیندار گھوڑی کی چوری کی رپورٹ تھانے میں کرے تو اشرف علی تفتیش میں ساتھ رہے اور دینا کو خبر پہنچاتا رہے، اور اگر ممکن ہو تو اشرف علی تفتیش کو غلط لائن پر ڈالنے کی کوشش کرے۔ دینا اور اشرف علی میرے طریقہ تفتیش سے واقف تھے۔ انہیں معلوم تھا کہ میرے پاس گھوڑی کی چوری کی رپورٹ آگئی تو میں اُسی وقت کھوجی کو ساتھ لے کر تفتیش کے چل پڑوں گا۔ اس سکیم میں رائے کھوجی کا قتل شامل نہیں تھا۔ دینا اتنی دُور کی نہیں سوچ سکا تھا۔ تفتیش جب شروع ہوتی ہے تو تفتیش کرنے والے پولیس آفیسر کو بھی معلوم نہیں ہوتا کہ آگے چل کر کیا ہوگا۔

لڑکی کے فرار کے متعلق دینا کو یقین تھا کہ پیر تھانے میں رپورٹ نہیں دے گا کیونکہ یہ لڑکی اس کی کچھ نہیں گنتی تھی۔ پیر خود مجرم تھا۔ اس نے لڑکی کو جس بے جا میں رکھا ہوا تھا۔ یہ کسی کو بھی معلوم نہیں تھا کہ میں کھوجی کو صرف ایک کانٹیل کے ساتھ کھڑا اٹھانے کے لئے بھیج دوں گا۔ یہ اُبھے بھی معلوم نہیں تھا کہ میں یہ اقدام بھی کروں گا، لہذا رائے کھوجی کے قتل کی کسی نے سوچ بھی نہیں تھی۔

ہر کام سکیم کے عین مطابق ہوتا گیا۔ گھوڑی نکال لی گئی زمیندار نے وقت ضائع کئے بغیر تھانے میں رپورٹ دی۔ میں نے اُسی وقت عثمان کو دو کانٹیلوں کے ساتھ جاتے واردات پر بھیج دیا۔ اشرف علی

پر سپر کی چھت پر گیا اور نیچے آکر راسے کھوجی سے کہا تھا کہ وہ ایک کانشیل کو ساتھ لے کر کھڑا اٹھاتا جاتے، اُس وقت اشرف علی نے کہا کہ وہ کھوجی کے ساتھ جانا چاہتا ہے۔ اُسے بھیج دیا گیا۔ اپنے بیان کے اس مقام پر آکر اشرف علی نے اپنے بھیا نک جرم کا اعتراف کیا۔ اس نے بتایا کہ راسے کھوجی بالکل صحیح کھڑے پر جا رہا تھا۔ وہ اُس دیرائے میں پہنچ گیا جہاں وہ قتل ہوا تھا۔ اشرف علی کے کہنے کے مطابق اُس وقت مینا وہاں سے ڈریٹھ دو میل کے فاصلے پر چھوٹے سے ایک گاؤں میں موجود تھا اور لڑکی اُس کے ساتھ تھی۔ اشرف علی کو معلوم تھا کہ مینا کو اس گاؤں میں آنا تھا۔ راسے کھوجی کھڑا اٹھاتے اُدھر ہی جا رہا تھا۔

### ضمیر گناہ کا بوجھ نہ اٹھا سکا

میں نے ابتدا میں کہا ہے کہ جرم گناہ بھی ہوتا ہے اور حماقت بھی۔ اشرف علی عقل والا کانشیل تھا۔ اُس نے یہ سوچا کہ راسے کھوجی اُس گاؤں میں جہاں مینا تھا پہنچ جاتا تو مینا اسے غائب کر دیتا لیکن شرف نے مینا سے زیادہ انعام لینے کی خاطر راسے کو قتل کر دیا۔ قتل اس طرح کیا کہ اُس کی گردن اسنے ہاتھوں میں پکڑ لی۔ انگوٹھوں سے شررگ دباتی اور اُسے مار دیا۔ اُس نے لاش درختوں کے پتے اور شاخیں توڑ کر ان میں چھپا دی۔ اس جگہ سے کوئی نہیں گزر رہا تھا۔ اوٹ

بہت بھتی۔ شرف کو یقین تھا کہ رات کو بھیڑیتے، گندڑ اور کلڑیگے لاش کو کھالیں گے۔ اس سے یہ پتہ ہی نہیں چلے گا کہ راسے کھوجی کی طرح قتل ہوا ہے۔ اشرف علی اُدھر اُدھر ٹھہرتا رہا، کہیں بیٹھا رہا اور شام کو اس گاؤں میں پہنچ گیا جس کے نمبر دار اور آدمیوں کے ساتھ وہ تھانے آیا تھا۔ اُس نے یہ کہانی گھڑی جو اُس نے مجھے سنائی تھی کہ جا رہا آدمیوں نے راسے کھوجی کو ڈنڈوں سے مار ڈالا ہے۔ اُس کی توقع کے عین مطابق میں جاتے قتل پر گیا تو وہاں راسے کی ہڈیاں پڑی تھیں۔ خون نہیں تھا۔ میں مان گیا کہ مقتول کو ڈنڈوں سے مارا گیا ہے اس لئے کوئی زخم نہیں ہوا۔ اشرف علی نے بتایا کہ اُس نے لاش کہیں اور چھپائی تھی۔ درندے وہاں سے گھسیٹ کر کہیں اور لے گئے تھے۔

اشرف علی نے قتل جیسا بھیا نک جرم پہلی بار کیا تھا اس لئے اُس کا ضمیر برداشت نہ کر سکا۔ وہ نوکری سے بھاگ جانے کی سوچ رہا تھا۔ جرم کرنے تک وہ جرم پر سوار تھا اور خوش تھا کہ دُنيا اور اذیت کا قانون اُس کے ہاتھ میں ہے مگر جرم کے بعد جرم اُس پر سوار ہو گیا اور وہ پناہ میں ٹھونڈنے لگا۔ عثمان نے اور میں نے جب اس کی دو تین کمزوریاں پکڑیں تو اُس کے چہرے کا رنگ بدل گیا اور اس کی زبان تھتھیلنے لگی۔ گناہ کے بعد انسان کی یہی حالت ہوتی ہے جب عثمان نے اُسے گرا کر ڈنڈا اُس کے مُنہ میں ڈالا تو پانچ منٹ کے اندر اُس نے اقبال جرم اگل دیا۔ یہ اس اذیت کا اثر نہیں تھا جو اُسے عثمان



میں اسی پر کیس ختم کر سکتا تھا لیکن میں نے اور عثمان نے تہیہ کر لیا کہ اب کے پینا کو بچرٹنا ہے۔ اشرف علی نے ہمیں بڑا صاف اشارہ دے دیا تھا کہ ان دونوں پینا کہاں ہوگا۔ مجھے اندازہ تھا کہ وہ ان دونوں نیلی آنکھوں والی لڑکی کے ساتھ گمن ہوگا۔ میں نے بہرہ میں بھجھ بیٹھے۔ میں نے انہیں خبردار کر دیا تھا کہ اگر انہوں نے دھوکا دیا تو میں ان کے سارے خاندان کو گرفتار کر لوں گا۔ بھجھ چلے گئے تو میں گھوڑی کے مالک (زمیندار) کے گھر چلا گیا۔ میرے پُر چھنے پر اُس نے بتایا کہ اُسے مینا نے پیغام بھیجا تھا کہ وہ اس لڑکی سے توجہ بٹالے ورنہ اسے قتل کر دیا جائے گا۔ زمیندار نے پیغام کا وہی جواب دیا تھا جو اشرف علی نے بتایا تھا۔ زمیندار نے اس کی تصدیق کی کہ مینا نے اُسے دھمکی بھیجی تھی کہ لڑکی کو وہ اسی کی گھوڑی پر لے جاتے گا۔

”میں اسے گدہ بڑھ چکی سمجھا تھا۔“ زمیندار نے کہا۔ ”لیکن گھوڑی چوری ہو گئی تو میں ڈر گیا۔ میں نے دانستہ مینا کا نام نہیں لیا تھا، مجھے ڈر تھا کہ مینا کو پتہ چل گیا تو وہ مجھے قتل کرادے گا۔“

## مینا کا خشن ہمارا چھاپہ

زمیندار کی اس حماقت پر مجھے بہت غصہ آیا۔ اگر وہ پھلے بتا دیتا تو میرا کھوجی قتل نہ ہوتا۔ میں نے اُسے بتایا کہ چوروں کا سامھتی اُس کے

نے دی تھی بلکہ یہ اُس اذیت کا اثر تھا جو اُس کا ضمیر اُسے دے رہا تھا۔ یہاں میں ایک اور وضاحت ضروری سمجھتا ہوں۔ ہو سکتا ہے میرے بعض قارئین سوچ رہے ہوں کہ مینا نامی گرامی جراثم پیشہ تھا اور وہ اپنے فن کا استاد بھی تھا، پھر اُس نے یہ حماقت کیوں کی کہ زمیندار کی گھوڑی چراتی اور اس پر لڑکی کو اغوا کر لیا۔ کیا مینا کسی اور گھوڑی کا انتظام نہیں کر سکتا تھا؟ عرض یہ ہے کہ مینا ایک درجن گھوڑوں کا انتظام کر سکتا تھا، اور اُس کے اپنے گھوڑے بھی تھے لیکن اُس نے زمیندار کو چیلنج کیا تھا کہ وہ اُس کی گھوڑی پر لڑکی کو اپنے پاس لاتے گا۔ یہ اُس دُور کے ڈاکوؤں وغیرہ کا دستور تھا جو انہیں لٹکارے اُس پر وہ لٹکار کر حملہ کیا کرتے تھے۔ وہ پولیس تک کو چیلنج کیا کرتے تھے۔ زمیندار نے مینا کو لٹکارا تھا۔ اس کے جواب میں اُس نے وہی کیا جو اُس نے کہا تھا۔

میں نے اشرف علی کا مکمل اقبالی بیان لکھ کر اُسے حوالات میں بند کر دیا۔ دوسرے دن اُسے عثمان کے ساتھ پندرہ میل دُور متلع پھری میں بھجھٹ کے پاس بھیج دیا جس نے اس کا پورا بیان تلکندہ کر لیا۔ اُسے سلطانی گواہ بنانے کی بھی قانونی کارروائی مکمل کر لی گئی اور اُسے جیل کی حوالات میں بھیج دیا گیا۔

اب میرے سامنے سب سے بڑا مسئلہ مینا کی گرفتاری کا تھا۔ میں اسے نظر انداز بھی کر سکتا تھا۔ مجھے رائے کھوجی کا قاتل مل گیا تھا۔

کر کے بہت فاصلے اور وقفے سے نکلے تاکہ پینا کا کوئی مجبور دیکھ رہا ہو تو اسے شک نہ ہو۔ گاؤں سے دُور جا کر ہم اکٹھے ہوتے۔ عثمان ہنسی مذاق کے مٹو میں تھا۔ اس سے پیدل سفر آسان ہو گیا۔ کانشیل بھی گپ شپ لگاتے جا رہے تھے۔ میں نے رفتار دُرِ اسست رکھی۔ میں رات کے آخری پہر وہاں پہنچنا چاہتا تھا۔

چاندنی شفاف تھی۔ ہم دو بجے کے لگ بھگ اپنے تاریک گھٹ پر پہنچے۔ میں نے نفری کو ضروری ہدایات دے کر محاصرے کے لئے پھیلا دیا مگر گاؤں کے قریب گئے تو ایک گولی فائر ہوئی۔ ہم سب نے پوزیشنیں لے لیں۔ میں سمجھ گیا کہ مینا نے پہرہ بیدار رکھا ہوا ہے اور یہ گولی اُسے خبردار کرنے کے لئے اُس کے کسی آدمی نے فائر کی ہے۔ میرے ایک کانشیل نے گھبرا کر فائر کر دیا۔ ہیڈ کانشیل نے بلند آواز سے کہا — ”حکم کے بغیر گولی مت چلاؤ“۔ یہ میری پارٹی کی دوسری غلطی تھی۔ دشمن بیدار ہو گیا۔ یہ یقین ہو گیا کہ مینا یہیں ہے۔ میں نے اور عثمان نے دوڑ دوڑ کر کانشیلوں کو اچھی پوزیشنوں میں کر دیا اور انہیں بتادیا کہ اب گاؤں میں کوئی سایہ بھی نظر آجائے تو اُس پر گولی چلا دو لیکن گولی ضائع نہ جاتے۔

مینا کے آدمی بیوقوف معلوم ہوتے تھے۔ ہمیں کچے کچے جھونپڑوں کی چھتوں پر سین چار آدمی چڑھتے دکھائی دیتے۔ چاندنی میں وہ دُور سے بھی نظر آ رہے تھے۔ لیکن کئی گولیاں فائر ہوئیں۔ یہ میرے

گھر میں موجود ہے۔ میں نے اُس کے نوکر کو گرفتار کر لیا۔ تھانے میں آکر اُس نے اقبال جرم کر لیا۔ اس دوران ہم نے قتل کا کیس سمجھ کر نے کے لئے کاغذی کارروائی اور اشرف علی کے بیان کے مطابق شہادتوں کی فراہمی کا کچھ کام کر لیا۔۔۔ اسی رات یا شاید اگلی شام تھی کہ ایک مجبور آ گیا۔ اُس نے بتایا کہ مینا ایک جگہ جشن منا رہا ہے۔ یہ جٹانوں کے درمیان چند ایک جھونپڑا نما سکانوں کا گناہم سا گاؤں تھا۔ چٹائیں ہری بھری تھیں۔ میں نے یہ جگہ کئی بار دیکھی تھی۔ خوبصورت جگہ تھی۔ اس سے پہلے بھی مجھے پتہ چلا تھا کہ مینا کبھی کبھی یہاں آتا ہے۔ گاؤں کے لوگ کھیتی باڑی اور محنت مزدوری کرتے تھے لیکن یہ مشکوک لوگ تھے۔ میرا مجبور دوسرے مجبور کو اسی علاقے میں چھوڑ آیا تھا تاکہ وہ مینا پر نظر رکھے اور وہ کہیں اور چلا جاتے تو اُس کا تعاقب کیا جاسکے۔ یہ گاؤں تقریباً سات میل دُور تھا۔ چھاپے کاموزوں وقت آدھی رات کے بعد کا تھا۔ اُس وقت انسان کی میند گہری ہوتی ہے۔ میں گھوڑوں کا انتظام کر سکتا تھا لیکن مجھے خاموشی قائم رکھنی تھی جو گھوڑوں اور مٹوؤں کے ساتھ ہونے سے ممکن نہیں تھی۔ میں نے بارہ کی نفری ساتھ لی۔ ان میں ایک ہیڈ کانشیل بھی تھا۔ ان سب کے پاس ۱۰۰ ربلور کی مسکٹ رائفلیں تھیں۔ ان کے رائفٹروں میں چھترے ہوتے ہیں۔ میرے ساتھ عثمان بھی تھا۔ ہم دونوں کے پاس رلیو الورتھے۔ ساتھ کافی ایمونیشن لے لیا اور ہم رات گیارہ بجے روانہ ہوئے۔ تھانے سے ہم ایک ایک

اتنے بڑے بڑے پتھر بھی جن کے پیچھے ایک آدمی بیٹھ سکتا تھا۔

ہم آگ میں کود گئے

مجھے بہت دیر تک عثمان نہ ملا۔ میں ایک ایک کانٹیل کو تلاش کرتا ہر ایک سے پوچھنے لگا کہ عثمان کہاں ہے؟ ہر کسی نے کہا ”اُدھر چلا گیا ہے۔“ میں نے دو پتھر کاٹے۔ عثمان نظر نہ آیا۔ ہیڈ کانٹیل مل گیا۔ کہنے لگا ”عثمان صاحب گاؤں کے اندر چلے گئے ہیں۔ میں بھی جا رہا ہوں۔“ اور وہ دوڑ کر جھمپڑوں میں غائب ہو گیا۔ میں نے عثمان کو ایسی ہدایت نہیں دی تھی۔ اُس نے خود ہی خطرہ مول لیا تھا۔ میں احمقوں کی طرح وہاں کھڑا دیکھنے لگا کہ اب کیا ہو گا۔ گاؤں کا قریبی جھونپڑہ مجھ سے کوئی میں قدم تھا۔ میں دوڑ کر دیوار کے ساتھ ہو گیا۔ دیوار کا سایہ تھا۔ میں آگے کو سر کے لگا۔

اندر سے مجھے عثمان کی آواز سنائی دی۔ میں دروازے کی طرف گیا اور آہستہ سے عثمان کو آواز دی۔ اُس نے دروازہ کھولا۔ اُس کے ہاتھ میں جلتی ہوئی ٹارچ تھی۔ اندر سے ہی ہوتی ایک عورت اور آدمی کھڑے تھے۔ ان کے بچے بے خبری کی نیند سوتے ہوئے تھے۔ عثمان ان سے پرچہ چکا تھا کہ مینا کس مکان میں ہے۔ عثمان کو اس آواز نے زحور ۱۰ اتھاہ اس نے مجھے بتایا۔ میں نے اس آدمی سے

کانٹیلوں کی گولیاں تھیں۔ پھر خاموشی چھا گئی۔ اس کے بعد چھت پر کوئی حرکت نہ ہوئی۔ میں الگ اور عثمان الگ گاؤں کے ارد گرد تیز تیز گھومتے اور کانٹیلوں کو ہدایات اور حوصلہ دیتے پھرتے تھے۔ یہ کوئی قلعہ یا بہت بڑا گاؤں نہیں تھا۔ چند ایک جھونپڑے سے تھے جنہیں میرے بارہ آدمیوں نے اچھی طرح محاصرے میں لے رکھا تھا۔ چاندنی فائدہ دے رہی تھی۔ پانچ سات منٹ بعد گاؤں سے ایک دو گولیاں ناسر ہوئی تھیں پھر خاموشی چھا جاتی تھی۔

میں نے بلند آواز سے کہا۔ ”ٹھنہ باہر آ جاؤ۔ اب تم زندہ نہیں نکل سکو گے۔ گاؤں ایک سو سپاہیوں کے گھیرے میں ہے۔“

”آگے آؤ مک اُب۔ اُدھر سے لڑائی سنائی دی۔ یہ مینا بول رہا تھا۔“

مسلمان کے بچے ہوتو سامنے آؤ اور مجھے زندہ پکڑو۔“

تھوڑے تھوڑے وقفے سے کبھی میں مینا کو لڑکا رہتا کبھی عثمان اور کبھی مینا ہی لڑکا رہتا۔ مجھے یہ اطمینان تھا کہ میرا گھیرا مکمل اور مضبوط ہے اور مینا یہاں سے نہیں نکل سکے گا۔ میں نے گاؤں والوں کو بلند آواز سے کہا۔ ”تمام لوگ گھروں کے اندر رہیں جو باہر نکلے گا مارا جائے گا۔“

میں نے عثمان سے کہا کہ پنج بج کر کانٹیلوں کے پاس جاؤ اور سب سے کہو کہ آٹھ بج کر آگے بڑھنا شروع کریں اور گاؤں کے قریب ہوجائیں۔“

چاروں طرف ہر ایک کانٹیل کے پاس جاتے خاما وقت لگ گیا عثمان ہر کانٹیل کو خود آٹھ بج کر آگے بڑھا رہا تھا۔ وہاں درخت بھی تھے اور

جا کر پھریں گے۔

## عثمان کی خوش باش زندگی کی آخری صبح

عثمان کو معلوم نہیں تھا کہ یہ اس کی خوش باش زندگی کی آخری صبح ہے۔ اگر مجھے غیب سے اشارہ مل جاتا تو میں محاصرہ اٹھا لیتا، بیٹے کو بھاگ جائے دیتا، عثمان کو نہ مرنے دیتا۔

صبح روشن ہو گئی۔ ہم نے وہ مکان دیکھ لیا جس میں بیٹا تھا۔ میں اب ایک ایک قدم کی تفصیل بیان نہیں کر سکتا۔ کہانی بہت لمبی ہو گئی ہے۔ اچانک فائرنگ شروع ہو گئی۔ میرے کانٹیل بے تحاشہ فائر کر رہے تھے۔ میں نے اندازہ کر لیا کہ بیٹا کے ساتھیوں کے پاس راتقلیں کم ہیں۔ میں نے عثمان سے کہا کہ محفوظ طرف سے جاؤ اور چار پانچ کانٹیلوں کو ساتھ لے آؤ۔ تھوڑی دیر بعد پانچ کانٹیل آگئے۔ ہم نے اس مکان پر ہلہ بولنا جس میں بیٹا تھا لیکن وہاں باتیں کی گولیوں نے ہمیں روک لیا۔ عثمان نے ریلواری کی گولی سے ایک آدمی کو ایک درخت میں سے گرایا۔ دو کانٹیل ایک مکان کی چھت پر چڑھ گئے۔ باہر سے ہیڈ کانٹیل نے فائرنگ جاری رکھی۔

اچانک شور مٹا۔ چند ایک آدمی برچھیاں اور تلواریں لے کے نکل آتے تھے۔ میں نے عثمان نے اور کانٹیلوں نے گولیاں چلاتیں

کہا کہ ہمارے ساتھ باہر آؤ۔ اس نے بتایا تھا کہ بیٹا کے ساتھ ایک بڑی خوبصورت لڑکی ہے۔ عثمان نے پوچھا اس کی آنکھیں نیلی ہیں؟ اس آدمی نے جواب دیا کہ ہاں نیلی ہیں۔

اس آدمی کے ساتھ ہم دیواروں کے ساتے میں مینا والے مکان کی طرف بڑھنے لگے۔ میں نے ہیڈ کانٹیل سے جو عثمان کے ساتھ تھا کہا کہ وہ گاؤں سے باہر کانٹیلوں کو اپنی کمانڈ میں لے لے اور میری پکار پر حملہ کر آتے۔ ہیڈ کانٹیل چلا گیا۔ ہم آگے بڑھے ہی تھے کہ ایک گولی فائر ہوئی جو ہمارے درمیان سے گزر کر کچی دیوار میں لگی۔ ہم بیٹھ گئے اور تیزی سے سرکتے ایک اور دیوار کی اوٹ میں ہو گئے۔ چاندنی میں کوئی بیس قدم دور ہیں ایک آدمی غلط آجاس کے ہاتھ میں رائفل بھتی۔ وہ بے نصیب شخص ہمیں دیکھنے آیا تھا۔ عثمان نے اطمینان سے ریلواری فائر کیا۔ وہ آدمی ٹرک گیا۔ اس کی آواز نہ نکلی پھر وہ گر پڑا۔ ہمارے ساتھ جو آدمی تھا وہ بڑی طرح ڈر رہا تھا۔ ہم آگے بڑھنے سے ڈر رہے تھے۔ کچھ اور آگے بڑھے تو دو تین گولیاں فائر ہوئیں۔ ہم ٹرک گئے۔

صبح طلوع ہونے لگی۔ دن کی روشنی ہمارے لئے خطرناک تھی۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ میرے بارہ کانٹیلوں کے مقابلے میں گاؤں میں کتنے آدمی ہیں۔ وہ مکانوں کے سو بجوں میں تھے اور ہم بالکل سامنے عثمان نے بڑے شگفتہ انداز میں کہا۔ "نکر مہین ملک صاحب! اس (مینا) نے لاکار تھا کہ مسلمان کے بچے نہ تو سامنے آؤ۔ دن چڑھ رہا ہے۔ سامنے

کی راتقلوں کی نالیاں اُسے گھیرے میں لے چکی تھیں۔ وہ گر کر زخمی ہو گیا تھا۔ میں نے اُس کی جامہ تلاشی لی۔ اُس کی ناف سے پستول برآمد ہوا نیلی آنکھوں والی لڑکی دوڑتی آتی اور مینا سے لپٹ گئی، پھر اُس کے جسم کا جائزہ لے کر بولی۔ ”زخم زیادہ تو نہیں؟“

لڑکی کو جیسے معلوم ہی نہیں تھا کہ مینا پولیس کے گھیرے میں کھڑا ہے۔ اُس نے پیچھے مینا کے سینے سے لگا کر ہمیں قہر بھری نظروں سے دیکھا۔ وہ واقعی بہت خوبصورت تھی۔ گودارنگ اور نیلی آنکھیں اور اس کے نقوش اپنی ماں کے تھے۔

”چلاؤ گولی۔“ لڑکی نے مجھے کہا۔ ”ہم دونوں کو ایک ساتھ مار ڈالو۔“ میری انگلی میرے ریلو الور کے ٹریگر کو آدھا پیچھے لے گئی تھی۔

میرے دل میں عثمان کے غم کا انتقام تھا مگر مجھے یاد آ گیا کہ میں تھاںیدار ہوں۔ میں ذاتی طور پر ذاتی انتقام نہیں لے سکتا۔ میں نے ٹریگر سے انگلی نکال لی۔۔۔۔ عثمان مر چکا تھا۔ مجھے ایک کانٹیل نے بتایا کہ عثمان میری جان بچاتے ہوئے مرا ہے۔ یہ کانٹیل دیکھ رہا تھا۔ ”آدمی نے برجھی مچہ پرستانی تھی۔ میری آدھر پیچھے تھی۔ عثمان کہیں قریب تھا۔ اُس نے برجھی والے پر ریلو الور فائر کیا لیکن گولی نہ چلی۔ اُس نے لمبی چیلانگ لگائی اور میرے اور برجھی کے درمیان آ گیا۔ برجھی عثمان کے دل میں اتر گئی۔ میں نے بعد میں اُس کا ریلو الور دیکھا۔ وہ چھ گولیاں فائر کر چکا تھا۔ ریلو الور میں اور کوئی گولی نہیں تھی

اور کئی ایک کو گرا لیا۔ ہم کچھ بھر گئے۔ میری توجہ کسی اور طرف تھی۔ مجھے اپنے پیچھے ’آہ‘ جیسی آواز سنائی دی۔ میں نے گھوم کر دیکھا تو مجھے چکر آ گیا۔ مینا کے ایک آدمی کی برجھی عثمان کے پیٹ میں اترتی ہوئی تھی اور عثمان دوہرا ہو گیا تھا۔ میں نے اس آدمی پر ریلو الور فائر کیا۔ وہ گر پڑا۔ اُس کی برجھی عثمان کے پیٹ میں رہی۔ عثمان گر پڑا۔ میں نے برجھی نکال لی لیکن برجھی پیٹ میں نہیں دل میں اتر گئی تھی۔ عثمان تنومند جوان تھا۔ گہرا لال خون چشمے کی طرح اُبل اُبل کر نکل رہا تھا۔

پھر میں نے نہیں دیکھا کہ گولیاں کہہ کر سے آتی ہیں موت کہاں اور زندگی کہاں ہے۔ یوں سمجھتے کہ میں پاگل ہو گیا۔ میں نے اپنے آدمیوں کو کیا احکام دیتے؟ انہوں نے تیزی سے عمل کیا کیسے؟ مجھے آج بھی یاد نہیں۔ یہ یاد ہے کہ میں چلا رہا تھا۔ باہر والے کانٹیلوں نے بھی (شاید میرے حکم پر) گاتوں پر ہلہ بول دیا تھا۔ پھر مجھے یہ یاد آتا ہے کہ ایک گھوڑا دوڑا تھا۔ اس پر مینا اور اُس کے پیچھے لڑکی سوار تھی۔ گھوڑا دوڑ نہیں تھا۔ کانٹیلوں نے گولیاں چلائیں تو میں نے چلا کر کہا تھا۔ ”گھوڑے پر فائر کرو۔ سواروں کو زندہ رہنے دو۔“ گھوڑا زخمی ہو کر بے قابو ہوا اور سر پیٹ دوڑتا، بے قابو ہو کر گھومتا دوڑے ہنستا گاؤں میں آ گیا اور دوڑتے دوڑتے گر پڑا۔ مینا قلابازیاں کھاتا مجھ سے آٹھ دس قدم دور آ کر کا اور لڑکی اس سے ذرا پرے گری۔ مینا جب اُٹھا تو میرے ریلو الور اور دو کانٹیلوں

اس کے بعد جو کچھ ہوا وہ پولیس کی کارروائی تھی۔ مینا کے چار ساتھی اور گاؤں کے پانچ آدمی مارے گئے تھے۔ زخمی بہت ہوتے۔ مینا اور اس کے دو ساتھیوں کو گرفتار کر کے میں انہیں گاؤں کے مردوں کے جلوس میں تھانے لایا۔ گاؤں کے لوگ گواہ تھے۔ جو گھوڑی ماری گئی تھی وہ زمیندار کی بھتی۔ عثمان کی موت نے مجھے ذہنی طور پر اودھ مٹا کر دیا تھا۔ مینا نے اتنا جرم نہ کیا اس لئے میں آپ کو اس کہانی کی گمشدہ کڑیاں نہیں سنا سکتا۔ یہ صرف مینا جانتا تھا۔ لڑکی نے عدالت میں پیر اور زمیندار کے خلاف شدید نفرت کا اظہار کیا تھا اور پوری طرح دلیری سے محبت کا ذکر کیا تھا مگر اس کی گواہی مینا کے خلاف گئی۔

اشرف علی وعدہ معاف گواہ تھا۔ اس نے بہت مدد کی۔ مینا کو قتل، رہزنی اور ڈاکے کی ان متعدد وار داتوں میں جن کے لئے وہ مطلوب تھا اور اشتہاری مجرم قرار دیا گیا تھا، سزا تے موت اور اس کے ساتھیوں کو عمر قید (کالا پانی) دی گئی۔ گاؤں کے چھ آدمیوں کو پانچ پانچ سال سزا تے قید دی گئی۔ زمیندار کے نوکر کو تین سال اور لڑکی کو اس کے ماں باپ کے حوالے کر دیا گیا۔ پیر حکیم صاحب کے خلاف کوئی کیس نہیں بنتا تھا۔ اس کی پیری پھٹے کی طرح چلتی رہی۔ میں نے کہانی کی ابتدا میں کہا ہے کہ دنیا کے قانون کو دھوکا دیا جاسکتا ہے، خدا کے قانون سے کوئی نہیں بچ سکتا۔ اشرف علی

عدہ معاف گواہ تھا اس لئے اسے سزا نہ ملی۔ اسے پولیس کی نوکری سے برطرف کر دیا گیا۔ وہ گھر چلا گیا۔ پندرہ بیس روز بعد پتہ چلا کہ اشرف علی نقل ہو گیا ہے۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ وہ میرے تھانے کے علاقے کا رہنے والا نہیں تھا۔ اسے قتل کرنے والے نامعلوم افراد تھے جو پھڑے نہیں گئے تھے۔ وہ یقیناً مینا کے گروہ کے آدمی تھے۔

